کامل بک ڈپو لاہور کا سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۶۴

ترکی مصر اور سوڈان

میں

انقلابی جہاد

یعنی

شہیدانِ حریّت

غازی مدحت پاشا، سعد زغلول پاشا اور سید محمد احمد مہدی سوڈانی کے ولولہ انگیز اور رُوح پرور کارنامے

مؤلفہ

محمد عبد المجید عتیقی

جسے

ارپردازان کامل بک ڈپو لاہور نے چھپوا کر شایع کیا

ت ــــــــــ ساڑھے آنے

بادہ نوشان حریت کی یہ وجد آفریں داستان
اُن مقدس اور محترم نفوس کی نذر ہے۔ جنہوں نے
وطن عزیز کی قربان گاہ پر مستانہ وار اپنی
جانوں کو بھینٹ چڑھا دیا ۔

عتیقی

فہرست مضامین

حرفے چند

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست ٭ آخر آمد زپس پردہ تقدیر پدید

ایک مدت سے احباب کا اصرار تھا اور خود راقم الحروف کی بھی خواہش تھی کہ "ترکان احرار" کا دوسرا حصہ شایع کر کے اسلامیان ہند کے دلوں میں وہ روح جہاد و حریت تازہ کی جائے۔ جو اسلام نے تیرہ سو سال سے اپنے پیرووں کے دلوں میں جاری و ساری کر رکھی ہے۔ اس خالق یکتا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ یہ دیرینہ آرزو اس کے فضل و کرم سے آج بر آئی ہے۔

"ترکان احرار" کو طول و عرض ہند میں جو قبولیت حاصل ہوئی ہے اس کے متعلق اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ ایک قلیل عرصہ میں آٹھ بار شایع ہو چکی ہے۔ اور نویں (9) ایڈیشن کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

"شہیدان حریت" کی اشاعت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ "ترکان احرار" کی طبع ہشتم میں مولانا سید سلیمان ندوی کا جو بلیغ دیباچہ از معلومات مفیدہ شایع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے غازی مدحت پاشا اور سعد زاغلول پاشا کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ چونکہ ترکان احرار مجاہدین ترکی کے حالات اور ترکی کے محاربہ حریت پر مشتمل تھی۔ نیز اس کی موجودہ ضخامت مزید اضافہ کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ لہذا یہی بہتر سمجھا گیا۔ کہ ان ہر دو بزرگوں کا تذکرہ دوسرے حصہ پر اٹھا رکھا جائے۔

"ترکان احرار جلد دوم" جہاں مجاہدین ترکی کے ولولہ انگیز حالات کا مرقع ہے۔ وہاں اس مجموعہ میں ان مجاہدین اسلام کے سر فروشانہ کارناموں کا مختصر سا نقشہ پیش کیا گیا ہے جنہوں نے گذشتہ سو سال میں مٹھی بھر ہمراہیوں کے ساتھ استعمار کا مقابلہ کیا جو خرمن ظلم و استبداد پر برق خاطف بن کر گرے۔ اور اپنے مقدس خون سے دنیائے اسلام کو سر بلند کیا اور ایسے نقش چھوڑ گئے۔ جو ہمارے طالبان حریت کے لئے شمع منزل کا حکم رکھتے ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت سے میرا مقصد و مدعا ان مسلمانوں کو توجہ دلانا ہے جو آج کثرت و قلت کے وساوس میں مبتلا ہو کر غلامی پر قانع نظر آتے ہیں۔ میری آرزو ہے کہ میرے ہم وطن مسلمان ان مجاہدین اسلام کی زندگی کا مطالعہ کریں اور یہ سوچیں کہ انہوں نے قلت کے باوجود کس عزیمت کا ثبوت دیا، کس استقلال و پامردی سے استبداد و استعمار کی چٹانوں سے ٹکرائے اور ان پر اسلامی روح جہاد کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

آزادی و سرفروشی کی ان داستانوں کو پڑھ کر اگر برادران قوم کے دل میں کسی جذبہ آزادی بیدار ہو جائے۔ ان کے دل بھی آتش حب الوطنی سے گرما جائیں تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔

ان مختصر سے الفاظ کے ساتھ میں اس داستان حریت کو فرزندان ملت خصوصاً عزیزی شمشیر علی نسیم صدیقی کے مطالعہ کے لیے پیش کرتا ہوں؛

اودھے
۱۷ مئی سنہ ۱۹۴ عیسوی

خاکسار
عتیقی
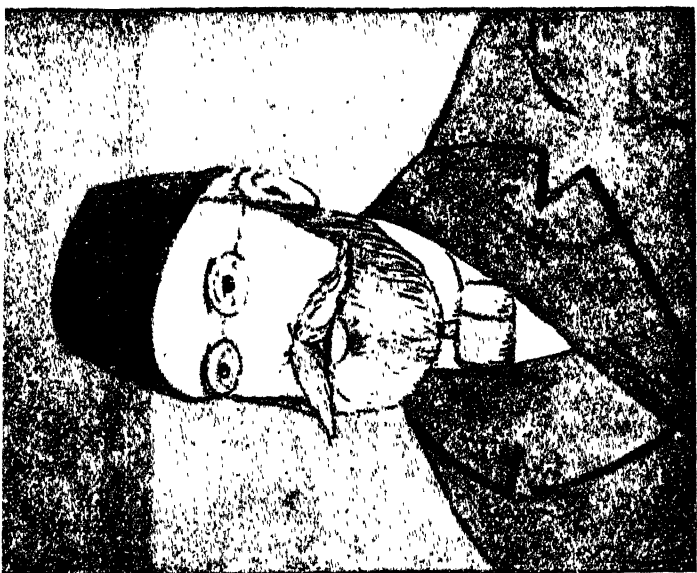
مدحت پاشا

مدحت پاشا

آج کا آزاد ترکی اپنی آزادی وحریت اور دستوری ترقی کیلئے جن اعاظم رجال اور سرفروش فرزندوں پر ناز کرسکتا ہے۔ ان میں مدحت پاشا مرحوم کو خصوصیت کا مقام حاصل ہے۔

ولادت:۔ یہ عجیب وغریب اور اولوالعزم شخص ۱۲۳۸ھ میں بمقام قسطنطنیہ پیدا ہوا والدین نے اسکا نام احمد شفیق رکھا۔ دس برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور حافظ شفیق کہلانے لگا۔ ۱۲۴۹ھ میں اس نے لکھنا سیکھا اور اگلے ہی سال وزیر خارجہ کے حکم سے "دیوان ہمایونی" میں داخل کر لیا گیا۔ جہاں اس نے اس محکمہ کے مخصوص رسم الخط کی مشق کی۔ اور جب وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو اس کی تعلیم گاہ نے اپنے رواج واصول کے مطابق اس کو "مدحت" کا لقب دیا یہاں سے حافظ شفیق "مدحت" کے نام سے روشناس عالم ہونے لگا۔

تعلیم وتربیت:۔ مدحت کی تعلیم کی تاریخ وداستان بہت مختصر ہے۔ اس کے والد حکومت عثمانیہ ایک قاضی تھے۔ اور فارغ التحصیل عالم تھے۔ اس لئے انہوں نے مدحت کو فارسی عربی اور دینی علوم کی تعلیم دینی شروع کی۔ بچہ ہونہار اور ذہین تھا۔ اسنے بہت جلد آستانہ کی مسجد جامع فاتح میں۔ دینی علوم کی تکمیل کر لی۔ اور فارسی زبان کا بھی ماہر کامل ہوگیا۔

ملازمت اس کی تعلیم کی تکمیل ۱۲۵۷ھ میں ہوئی۔ اور اس کے بعد وہ پوری طرح عملی زندگی میں داخل ہوگیا۔ ۲۵ قرش پر اسے ایک مستقل جگہ مل گئی۔ اور ولایت شام میں وہ سرکاری کاغذات کی تحریر کا کام کرنے لگا۔ بالآخر مختلف ولایات اور صوبوں میں گھومنے کے بعد ۱۲۶۴ھ میں وہ قسطنطنیہ واپس آیا۔ اور اسے رشتۂ ازدواج میں منسلک کرکے زندگی کی اہم ذمہ داریاں سپرد کر دی گئیں اسی زمانے میں اس کو وزیر اعظم کے دفتر میں انشا رکتابت کی معزز جگہ مل گئی۔ اور اس پر اعلیٰ اور سرکاری مناصب کا دروازہ کھل گیا۔ اور وہ ملک کے اہم اور جلیل القدر عہدوں پر مامور ہونے لگا۔

محیر العقول کارنامے:۔ مدحت پاشا کی زندگی کے اہم ترین کارنامے اس سرفروش اور مسلسل جد وجہد سے

تعلق رکھتے ہیں جو انہوں نے اپنی قوم اور ملک کو وقت کے سلطان جابر کی سخت گیریوں اور خود مختاریوں سے نجات دلانے کے لئے زندگی بھر کی اور جس کی راہ میں اس نے اپنی متاع حیات اور عیش و آرام کو بھی قربان کر دیا۔ انسانی ذہن جن تکالیف و مصائب کی ایجاد کا تصور کر سکتا ہے۔ ان میں کا اکثر حصہ ان کو برداشت کرنا پڑا۔ اور حق یہ ہے کہ مردان حق کا دنیا میں عموماً اجر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ تاہم مدحت پاشا نے زندگی کا ابتدائی اور وسطی حصہ اعلیٰ مناصب اور ذمہ دار عہدوں پر فائز رہ کر بھی گذارا اور اس سلسلے میں بھی انہوں نے اپنے وطن عزیز کی عظمت و اقبال کے استحفاظ و قیام کے لئے جلیل القدر اور ناقابل فراموش و انکار خدمات سرانجام دیں۔ زندگی کے اس دور میں ان کی راہ عمل میش تر رہی تھی۔ جو کسی آزاد ملک کے دیانتدار فرزند کو اختیار کرنی چاہئے یعنی انہوں نے اپنے فرائض ملازمت اختیار کو دیانتداری خلوص اور محنت کے ساتھ ادا کیا۔

جوش عمل کا اولین مظاہرہ: ۱۲۶۷ھ میں حلب شام کے سرکاری خزانے میں سخت بدنظمی پیدا ہوئی۔ حتیٰ کہ خزانہ حکومت کے بیس تھیلے غائب ہو گئے۔ اس معاملے کی تفتیش کے لئے مدحت آفندی کو مامور کیا گیا۔ اور اس کو خفیہ طور پر ہدایت کی گئی۔ کہ وہ عربی ممالک کے سپہ سالار اعظم محمد پاشا قبرصلی کے طرز عمل کی بھی تحقیقات کرے۔ ۶ ماہ کی عرق ریز محنت کے بعد اس نے ثابت کیا کہ بدنظمی غبن اور بددیانتی کی وسعت اس سے بہت زیادہ تھی جس قدر حکومت کو معلوم ہوئی تھی۔ بیس تھیلے نہیں ۵ ہزار تھیلے چوری ہوئے تھے اس نے چور کا بھی پتہ چلا لیا اور ایک ہزار تھیلے بھی وصول کر لئے۔

دو سال بعد مدحت کو مجلس والا کی صدارت کا عہدہ جلیلہ تفویض کیا گیا اور یہاں بھی اس نے ثابت کر دیا کہ وہ ہر بڑے سے بڑے مصائب کا اہل ہے۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں وہ رشید پاشا عالی پاشا رشدی پاشا وغیرہ کا معتمد علیہ بن گیا۔ چنانچہ مسئلہ کریمیا کے تصفیئے کے لئے جب روسی سفیر پرنس منیچکوف قسطنطنیہ آیا تو معاہدوں کی تشکیل مدحت ہی کو سپرد کی گئی

مشکلات کا آغاز: مدحت آفندی کی یہ روز افزوں ترقی اسے بتدریج اس مقام کی طرف لا رہی تھی۔ جس کے لئے فطرت نے اسے منتخب کیا تھا۔ اور

جس راہ کی پہلی منزل یہ تھی کہ اسے بعض ارکان حکومت کی مخالفت و عداوت کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

چند برس پہلے اسے حلب کے جنگی خانہ کی بدنظمیوں کی تحقیقات اصلاح اور محمد پاشاہ قبرصلی کے حالات کی خفیہ تفتیش کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اور اسی کی رپورٹ پر محمد پاشا کو عرب کی سپہ سالاری سے معزول کیا گیا تھا۔ لیکن اتفاقات زمانہ سے یہی محمد پاشا قبرصلی ۱۲۷۰ھ میں وزیر اعظم ہوگیا۔ وہ مدحت کا سخت دشمن تھا۔ اس نے برسر اقتدار آتے ہی مدحت سے انتقام لینا شروع کردیا پہلے اس نے اسے سرکاری ملازمت سے خارج کرادینا چاہا۔ لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ رومیلی کے صوبوں کا حاکم بنا کر بھیج دیا تاکہ وہ وہاں کی تشویشناک حالت کے باعث کامیاب نہ ہو اور نالائق قرار دے دیا جاسکے۔ لیکن مدحت کا خلوص ذہانت اور محنت رائگاں نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے ۲ ماہ کے قلیل عرصے ہی میں ۲۸۰ باغی سرغنوں کو گرفتار کرلیا۔ چار کو پھانسی دے دی ۴۰ کو استانہ کے قید خانے میں بھیج دیا اور باقی کو قانون کے مطابق سخت سزائیں دیں۔ مدحت نے اس طرح صوبجات رومیلی کی بغاوت کی آگ بجھا دی گئی اور یورپ جو بلقان کے معاملات میں مداخلت کے لیے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ نامراد ہوکر خاموش ہوگیا۔

اس اثناء میں محمد پاشا بھی معزول ہوچکا تھا۔ اور مدحت کا قدیم محسن رشید پاشا برسر اقتدار آگیا تھا۔ اس نے مدحت کی شاندار خدمات کا حوصلہ مندانہ اعتراف کیا۔ اور استانہ واپس بلالیا۔ مدحت آفندی نے رومیلی کے حالات کی اصلاح کے لئے کچھ اصلاحی تجاویز بھی پیش کی تھیں۔ لیکن حکومت کی حالت اس قدر خراب ہوچکی تھی کہ بنیادی تغیر کے بغیر اصلاحات کے نفاذ کی گنجائش نہ نکلی۔ مدحت پھر مجلس والا میں داخل کرلیا گیا۔ لیکن زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ رشید پاشا معزول ہوگئے اور علی پاشا وزیر اعظم ہوئے۔ پھر وہ بھی سفر یورپ پر روانہ ہوگئے۔

انتقام کا دوسرا وار۔ مدحت کا قدیم دشمن محمد پاشا قبرصلی پھر برسر اقتدار آگیا۔ اس نے آتے ہی مدحت پر بانفذ صاف کرنا چاہا۔ اس پر حکومت کے بعض محاصل پر قبضہ کرنے کی تہمت لگادی۔ لیکن مدحت پہلی پیشی ہی میں صاف بری ہوگیا۔ ایک گواہ نے تو علانیہ عدالت کے سامنے اعتراف کرلیا کہ اسے جھوٹ بولنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ وزیر اعظم اس نامرادی سے اور زیادہ شرمندہ ہوا۔

سرویہ اور بلغاریہ کی بغاوت:۔ اس واقع کے بعد بلغاریہ میں بغاوت و سرکشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ حکومت نے مدحت کو اصلاح حال کے لئے بھیجا۔ اس نے روداد پیش کی کہ حالات کی خرابی کا باعث خود حکام کا ظلم ہے چنانچہ حکومت نے گورنر اور اس کے عہدہ داروں کو معزول کردیا۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد مدحت کو سرویہ کی بغاوت کے فرد کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسے پوری کامیابی دی۔ اب مدحت کی شہرت ونیکنامی اوج کمال کو پہنچ گئی تھی۔ اور اس کے حاسدوں کا بغض وعناد بھی انتہائی صورت اختیار کرگیا۔ سوئے اتفاق سے اس وقت سلطان عبدالمجید پر گورنر سعید پاشا مسلط ہوگیا تھا۔ اور اس نے سلطان کو مدحت سے ناراض کردیا تھا۔ ادھر رشید پاشا بھی انتقال کرچکے تھے۔ ان حوادث سے مدحت دل برداشتہ ہوگیا۔ اور اس نے سرکاری خدمت سے علیحدہ ہوجانے کا ارادہ کرلیا۔

سفر یورپ:۔ ۱۲۷۳ھ میں وہ یورپ روانہ ہوگیا۔ اور ۶ ماہ کے قیام میں اس نے یورپ کی ترقی کے اسباب ووسائل سے گہری واقفیت بہم پہنچائی اور لندن پیرس ویانا اور بلجیم کے حالات کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ مدحت نے فرانسیسی زبان بھی سیکھ لی۔

زندگی کا دوسرا دور:۔ جب وہ ۱۲۷۵ھ میں واپس آیا تو دوبارہ مجلس والا کی صدارت کے لئے منتخب کرلیا گیا۔ ادھر مدحت اس منصب جلیل پر فائز ہوا۔ اور ادھر اس کا قدیم دشمن محمد پاشا قبرصلی پھر وزیر اعظم ہوگیا۔ مدحت کو اندیشہ تھا کہ وہ اپنی عادت کے مطابق انتقام وعداوت کا سلوک کرے گا۔ لیکن اس کی توقعات کے برعکس محمد پاشا قبرصلی نے اس سے مصالحت کرلی۔ اپنی حرکتوں کے لئے معافی چاہی۔ سلطان عبدالمجید سے سفارش کرکے وزارت کا اعزازی رتبہ

دلوایا اور صوبۂ نیش کی حکومت دلوا دی ۱۲۷۷ھ سے سلطان عبدالمجید کی وفات تک وہ اس عہدے پر فائز رہا۔

سلطان عبدالعزیز کی تخت نشینی:۔ سلطان عبدالمجید کے بعد سلطان عبدالعزیز تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ یہ سلطان اپنے وزیر اعظم ندیم پاشا کے قبضے میں تھا۔ اور ندیم پاشا روسی سفیر اگناٹیف کے چشم و ابرو کے احکام کا منتظر رہتا تھا۔

ان غدارانہ حالات کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ داخلی طور پر رعایا برہم ہو گئی۔ اور خارجی اعتبار سے بلقان میں بغاوت نمودار ہو گئی ہرزی گوینیا کے صوبے کا مسئلہ پیش آگیا آستانہ کے طالب علم بھڑک اٹھے اور روس کو مداخلت کا موقع مل گیا۔ آستانہ کے طالب علموں کے ساتھ ہزاروں مخلوق باب عالی پر چڑھ دوڑی اور سلطان نے ان کو مطمئن کرنے کے لئے ندیم پاشا اور حسن آفندی شیخ الاسلام کو معزول کر دیا۔ رشدی پاشا وزیر اعظم اور خیر اللہ آفندی کو شیخ الاسلام بنا دیا۔ مدحت پاشا کو بھی نئی وزارت میں جگہ عطا ہوئی۔ اور مجلس اعلیٰ کا رکن بنا دیا گیا۔

لیکن اس سطحی تبدل و تغیر سے قوم مطمئن نہ ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ سلطان بدستور ندیم پاشا کے قبضے میں ہے۔ اور روسی سیاست تمام معاملات پر چھائی ہوئی ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جب تک سلطان ہی کو معزول نہ کیا جائیگا ترکی کی آزادی و عزت برقرار نہیں رہ سکتی اس فیصلے کی اطلاع فوراً العزیز پھیل گئی۔ سلطان نے سنی تو اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

مدحت پاشا کی اصلاحی سکیم:۔ والدۂ سلطان نے مدحت پاشا سے دریافت کیا کہ قوم کو کس طرح مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اصلاحات کا ایک مسودہ طیار کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ اور کہا کہ اس سے رعایا مطمئن ہو جائے گی۔ لیکن سلطان عبدالعزیز اس قدر جھکنے کے لئے طیار نہ تھے نتیجہ یہ ہوا کہ بے چینی بڑھتی گئی۔ اور بالآخر سلطان کو معزول کر دیا گیا۔ اور مراد آفندی ولی عہد کو سلطان ترار دے دیا گیا۔

شاہزادہ مراد کی تخت نشینی:۔ سلطان عبدالعزیز نے سلطان مراد کے تقرر

پر خود مبارکباد دی لیکن چند روز ہی کے بعد اس نے ایک قینچی سے اپنے بازو کی رگیں کاٹ لیں اور خودکشی کر کے ہلاک ہو گیا۔ افسوس کہ سلطان مراد کی تخت نشینی بھی ترکی کو راس نہ آئی۔ تخت نشینی کے وقت لاکھوں کا مجمع قصر شاہی کے سامنے جمع تھا۔ سلطان نے اس قسم کے مناظر پہلے کبھی نہیں دیکھے ان کے اعصاب پر ان کا بہت بُرا اثر پڑا۔ اور وہ عصبی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ اور جب انہوں نے سلطان عبدالعزیز کی خودکشی کی خبر سنی تو وہ بالکل دیوانہ ہو گئے۔ سلطان کی بیماری کو حتی الوسع مخفی رکھا گیا تھا۔ لیکن معاملات سلطنت بالکل معطل ہو گئے تھے۔ وزارت اس مصیبت کو برداشت کرنے کے لیے سر توڑ جد و جہد کر رہی تھی۔ رات رات بھر اس کے اجلاس ہوتے تھے۔ ایک رات سلطان عبدالعزیز کے لڑکے شہزادہ یوسف عزالدین کے ایک اڈیکانگ حسن چرکسی نے وزیر جنگ سے ایک ضروری معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے اجازت طلب کی اسے اندر بلا لیا گیا لیکن اس نے آتے ہی حسین عونی پاشا پر پستول سے حملہ کیا۔ گولی انکے سینے پر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اس کے بعد اس نے قیصرلی احمد پاشا وزیر بحر کو زخمی کیا۔ اور راشد پاشا کو قتل کر دیا۔ اس واقعے سے وزارت ترکی دو بہترین آدمیوں سے محروم ہو گئی۔ دوستوں کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ اور دشمنوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ چنانچہ بلقان اور جزیرہ کریٹ میں بغاوت ہو گئی۔ لیکن ترکی مدبرین نے حوصلہ نہ ہارا ہر طرف فوجیں روانہ کر دیں۔ اور بغاوت و شورش کا خاتمہ کر دیا۔

سلطان عبدالحمید کی سر براہی:۔ اس وقت ترکی کی سب سے اہم مصیبت دیوانہ و مجنون سلطان کی خلافت و امارت تھی۔ ایسا بادشاہ و امیر جو اپنے دماغ اور جسم پر بھی قابو نہ رکھتا ہو ملک و حکومت کی ذمہ داریوں کو کیونکر نبھا سکتا تھا۔ چنانچہ مدحت پاشا اور ان کے رفقاء نے سلطان مراد کو معزول کر کے شہزادہ عبدالحمید کو جو ولی عہد تھے۔ تخت نشین کر دیا۔ مدحت پاشا نے دستور اساسی کا ایک مسودہ طیار کیا تھا۔ اس کو شہزادہ نے ملاحظہ فرمایا تھا اور بڑے ہی جوش سے کہا تھا کہ "سلطنت کی نجات ایسے ہی نظام حکومت سے ممکن ہے" اور یقین دلایا تھا کہ تخت نشینی کے بعد اسکی منظوری اور نفاذ کا اعلان کر دیا جائے گا۔ ۱۱ شعبان ۱۲۹۳ھ کو تخت نشینی کا اعلان

دیا گیا۔ اور تمام سلطنت محسوس کرنے لگے کہ اس جواں سال اور پر جوش بادشاہ سے ترکی سلطنت دوبارہ زندہ ہو جائیگی۔

ادہر سلطان تخت نشین ہوا۔ ادہر بلقان میں ترکی افواج کو فتوحات حاصل ہوئیں اور مسیحی شورش کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ لیکن روس اس شکست سے مایوس نہ ہوا۔ اور اس نے شرارت کے نئے حیلے تراشنے شروع کئے۔ چنانچہ یورپ کے پرانے حربے سے کام لیا گیا۔ دول یورپ کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ اور بلغاریہ کی داخلی خود مختاری کی تجویز منظور کر دی گئی۔

وزارتِ عظمےٰ:۔ اب وزارت عظمیٰ کا قلمدان رشدی پاشا وزیراعظم کے پاس تھا۔ وہ دول یورپ کے دباؤ کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو گئے۔ مجبور ہو کر مدحت پاشا نے قلمدان سنبھالا۔ مدحت پاشا نے پہلا کام یہ کیا کہ خالی خزانے کا منہ بھرنے کے لئے نئے بنک قائم کئے اور اس طرح اصلاح مال کی ابتدا کر دی۔ ادہر دستور اساسی کا مسودہ جسے سلطان عبدالحمید نے وطن و حکومت کا "نجات دہندہ" قرار دیا تھا۔ ایک مجلس کے سپرد ہو کر پوری بحث و تمحیص کے بعد منظور ہو چکا تھا۔ سلطان نے اس کو منظور کر لیا۔ اور ۷ ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ کو بڑے تزک و احتشام اور مسرت و ابتہاج کے مظاہروں کے ساتھ اس کا اعلان ہو گیا۔ پوری سلطنت نے جشن مسرت منایا۔

مدحت پاشا کی اصلاحی سکیم کا اثر:۔ دستور اساسی کے اعلان نے رعایا کے اندر نیا جوش۔ نئی زندگی اور نیا ولولہ پیدا کر دیا۔ حکومت ترکی کے ہاتھ بھی مضبوط ہو گئے۔ اور اس نے یورپ کی کانفرنس کی تجاویز کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا۔ یہ جرأت نہایت خطرناک تھی۔ لیکن غیور وزارت طے کر چکی تھی کہ ذلت و بے عزتی کے ساتھ تباہ نہیں ہوں گے۔ اور یورپ کی بدقماشیوں کو خاموشی سے برداشت نہیں کریں گے۔ عزت کے ساتھ برباد ہونا ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔ اس گستاخانہ حرکت سے یورپ نے سیاسی تعلقات منقطع کر لئے لیکن مدحت پاشا کی غیرت ملی اور حمیت اسلامی نے اس کی ذرہ برابر پروا نہ کی بلکہ دول یورپ سے بے نیاز ہو کر بلقانی ریاستوں سے براہ راست گفت و شنید کا آغاز کر دیا۔ اور انہیں نرم گرم شرطوں پر رضامند کر لیا۔

مدحت پاشا کا تدبر اور دستور اساسی کی جمہوری دفعات قوم میں اعتماد اور حیات جدید کی روح پھونک رہی تھیں۔ پہلی عثمانی مجلس یعنی پارلیمنٹ کے انتخابات نے اور بھی تازگی بخشی خلافت عثمانیہ نے ایک طویل مدت کے بعد زندگی بیداری، اعتماد ترقی اور عزت و سربلندی کی وادیوں میں قدم رکھا تھا۔ اور دول یورپ کو بھی اندیشہ پیدا ہو چلا تھا۔ کہ ترکی کا مرد بیمار تندرست ہو جانے والا ہے۔ لیکن افسوس قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

جلاوطنی:۔ ایک روز سلطان نے قصر طولمہ باغیچہ میں مدحت پاشا کو طلب کیا اور ان کے پہنچتے ہی ان سے قلمدان وزارت لے لیا۔ اور حکم دیا کہ جہاز عزالدین میں سوار ہو کر فوراً یورپ روانہ ہو جاؤ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ خدام ملک کے ساتھ اس سے زیادہ ناروا سلوک شاید ہی کبھی کیا گیا ہوگا۔

مدحت پاشا کی جلاوطنی کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک حیثیت مدحت پاشا سے تعلق رکھتی تھی دوسری ملک سے۔ اول الذکر کے اعتبار سے وہ مفید تھی۔ مدحت پاشا نے غیر معمولی محنت کی تھی۔ اور وہ آرام کے ضرورت مند تھے۔ لیکن ملک اور خلافت ان کی موجودگی سے محروم نہیں ہو سکتے تھے جس کی ڈانواڈول کشتی کو جس ناخدا کی ضرورت تھی وہ مدحت پاشا ہی تھے۔ ان کو آرام حاصل کرنے سے خوشی ہوئی لیکن وطن محبوب کی مصیبتوں کا خیال کر کے ان کا جگر خون ہو گیا۔

مدحت پاشا نے دریافت کیا کہ میرا قصور کیا ہے۔ سعید پاشا سلطان کے پاس گئے۔ اور واپس آ کر کہا کہ دستور اساسی کی رو سے سلطان کو حق حاصل ہے۔ کہ جس شخص کو پولیس و افسر اعلیٰ سلطنت کے لئے خطرناک بتائے وہ اسے ملک سے جلاوطن کر دیں۔ ساتھ ہی انہوں نے سرکاری کاغذ بھی دکھائے جن میں سے ایک میں لکھا تھا۔ کہ پولیس نے ایک فوجی افسر کو بازار میں کہتے سنا کہ "مدحت پاشا عنقریب ترکی جمہوریت کا صدر منتخب ہوگا۔"

اللہ اکبر کسی شخص کے "خطرناک" ہونے کے لئے استبداد کتنے عجیب استدلال پیش کرتا ہے۔ مدحت پاشا اس "بہانے" پر بے اختیار ہنس دیئے۔ سعید پاشا نے کہا سلطان نے سلام کہا ہے۔ اور عنقریب واپس بلا لینے کا وعدہ کیا ہے۔ مدحت پاشا نے جواب دیا۔ کہ سلطان کے پیغام و سلام کا شکریہ لیکن جب میں واپس آؤں گا تو سلطان ان محلات و قصور میں نہیں ہوں گے۔ سلطنت تباہ ہو چکی ہوگی اور میں تباہی

کو نہیں روک سکو نگا۔ یہ کہہ کر مدحت اپنے عزیز و محبوب وطن کے سواحل پر حسرت و افسوس کی نگاہ ڈالتے ہوئے جلا وطنی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ افسوس سلطان نے اپنی رعایا کا ایک بہترین فرزند کھو دیا۔

مدحت پاشا کی جلاوطنی شخصی مصیبت نہیں تھی۔ معاملہ تنہا مدحت کا نہیں تھا۔ بلکہ اس دستور اساسی کا بھی تھا۔ جو انہوں نے مرتب کیا تھا۔ اور غلب ہے کہ وہی انکی جلاوطنی کا باعث ہوا تھا سلطان مطلق العنان ہونا چاہتے تھے لیکن اس شخص کی موجودگی میں ایسا نہیں کر سکتے تھے جس نے ترکی قوم کو جمہوریت کی نعمت دلائی تھی۔ لوگوں نے اس جلاوطنی سے یہ نتیجہ بھی نکالا کہ اب دستور اساسی بھی باطل کر دیا جائیگا۔

الزام اور اس کی حقیقت :۔ اضطراب و تشویش کا علاج سلطان نے اسطرح کیا کہ مدحت پاشا پر نئی نئی تہمتیں تراشوائیں۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے اخبارات میں شائع کرایا گیا کہ ان کے کاغذات میں بعض ایسی چیزیں ملی ہیں جن سے ان کی خیانت ثابت ہوتی ہے۔ استبداد قیصریت کے طریقے دنیا بھر میں کتنے ہمرنگ ہیں۔ ہندوستان میں بھی ہر محب وطن کو خائن ثابت کرنیکی کوشش کی جاتی ہے اور ترکی میں بھی ایسا ہی ہو چکا ہے مدحت پاشا اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔ کہ سلطان کے اس "پرچار" سے ترک میرے مخالف ہو گئے لیکن یورپ کے اخبارات میں حقیقت حال شائع ہو گئی۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ عتاب سلطانی کا باعث یہ ہے کہ میں نے سلطان کی غلامی قبول نہیں کی۔ اس سے ترک میرے حامی ہو گئے۔ اب قصر شاہی نے ایک مستقل اور منظم سازش کا آغاز کر دیا۔ مقرروں نے تقریروں سے اور شاعروں نے نظموں سے میرے خلاف معرکہ جنگ برپا کر دیا۔ میں نے سنا تو افسوس کیا کہ کل تک یہی لوگ میری دیانت کے راگ گاتے تھے۔ آج وہ مجھ کو شیطان کہتے ہیں۔ افسوس واذا اراد اللہ بقوم سوءً فلا مرد لہ ومالھم من دونہ من وال یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی ہلاکت کا فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر اس کو اس ہلاکت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

روسی یورش :۔ مدحت پاشا کی جلاوطنی سے سب سے زیادہ خوشی روس کو ہوئی اس نے یقین کر لیا کہ ترکی اپنے نجات دہندہ سے محروم ہو گئی ہے۔ اور اس کو اب بالینا کچھ مشکل نہیں اس نے باب عالی سے اصرار کیا کہ وہ بلقان کے متعلق روسی مطالبات و تجاویز کو قبول کرلے۔ اور جب اس نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو روس نے اعلان جنگ کر دیا۔ ترکی کا خزانہ پہلے ہی خالی تھا۔ مدحت پاشا نے جو

نوٹ جاری کئے گئے تھے۔ ان کو سلطان پہلے ہی خرچ کر چکا تھا۔ مجبوراً رعایا سے جبراً روپیہ وصول کرنا شروع کیا گیا۔ سلطان کی ناتجربہ کاری کی مصیبت نے ترکی کو اور بھی پریشان کر دیا۔ اس نے عیدی پاشا اور ذلیف پاشا کو جو روسی سرحدوں سے واقف تھے۔ اور اس جنگ کے لئے پہلے ہی سے نقشے طیار کر چکے تھے۔ معزول کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معاملات جنگ کی باگ ناتجربہ کار ہاتھوں میں چلی گئی۔ پانچ لاکھ باقاعدہ فوج اور بے شمار رضاکار سپاہی کار آمد ہو گئے مختصر یہ کہ روس کو فتح حاصل ہوئی۔ اور اس کی متحد فوجیں مضافات قسطنطنیہ تک پہنچ گئیں

غربت میں وطن کی خدمت:۔ انگریزی حکومت نے بھی اپنا جنگی بیڑہ باسفورس میں بھیج دیا۔ اور اس نے قصر شاہی کے سامنے توپیں سیدھی کر دیں۔ اس وقت مدحت پاشا یورپ میں تھے۔ ان کا محب وطن دل اپنے ملک کی مصیبت پر بے چین ہو گیا۔ اور گو انہیں ترکی کی نمائندگی کا حق حاصل نہیں تھا۔ پھر بھی وہ یورپ کے مرکزی شہروں میں گھومے اور سین اسٹفانو کا ذلیل معاہدہ منسوخ کرایا۔ انہوں نے آسٹریا کو روس پر حملہ آور ہونے کے لئے بھی ضامند کر لیا تھا لیکن سلطان نے ان کے تار پر مطلق توجہ نہ کی۔

بہرحال ان کی خدمات رائگاں نہ گئیں۔ ان کا ملک بربادی سے بچ گیا۔ اور سلطان نے ان کو "معاف" کر دیا۔ دو سو پونڈ ماہانہ وظیفہ دیا۔ ایک ہزار پونڈ انعام دیا۔ اجازت دی کہ اپنے خاندان کے ساتھ جزیرہ کریٹ میں اقامت اختیار کر لیں یہ یکم شوال ۱۲۹۵ھ کا واقعہ ہے

شام کی گورنری اور مشکلات کا دوسرا دور:۔ دو ماہ کے بعد انہیں شام کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ انہوں نے معذرت کی لیکن سلطان نہ مانا۔ اور انہیں مجبوراً یہ عہدہ قبول کرنا پڑا۔ شام میں انہوں نے تعلیم کی طرف توجہات کو مبذول کیا۔ جبری تعلیم کا قاعدہ نافذ کیا۔ اور ہزاروں بچے زیور علم سے بہرہ مند ہونے لگے لیکن عین اس وقت جب مدحت پاشا اپنا جنون اصلاح پورا کر رہے تھے۔ پایۂ تخت میں ان کے خلاف از سر نو سازشیں شروع ہو گئیں۔ اور داماد پاشا اور رشدی پاشا وغیرہ جلا وطن کر دیئے گئے۔ اور جودت پاشا و سندیم پاشا سلطان کے مزاج میں دخیل ہو گئے۔ انہوں نے پارلیمنٹ کو بند کر دیا۔

دستور اساسی کو منسوخ کر دیا۔ استانہ کے اخبارات میں مدحت پاشا کے خلاف تحریریں شائع ہونے لگیں۔ اور یہ افواہ اُڑا دی گئی کہ وہ شام میں اعلان بغاوت کر کے خود بادشاہ ہو جانے والے ہیں۔ یہ سن کر مدحت پاشا نے استعفا داخل کر دیا۔ سلطان نے اسے منظور کیا لیکن سمرنا کی گورنری پر بھیج دیا۔ انہوں نے سمرنا میں بھی اصلاح و ترقی کے پروگرام پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

قوم پرستوں پر عتاب:۔ اس وقت سلطان کے مزاج کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ وہ اپنے مستقبل سے خائف تھے سلطان مراد کا جنون دور ہو چلا تھا۔ عبدالحمید ڈر رہے تھے کہ کہیں اسے پھر سلطان نہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ہر اصلاح پسند کو جلاوطن کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ ظلم و تعدی کی ایک اہم کڑی مدحت پاشا کی سرکوبی بھی تھی۔ چنانچہ ان کے خلاف سلطان عبدالعزیز کی خودکشی کے سلسلے میں سازش اور قتل کا الزام لگا کر مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ مدحت پاشا کو ان کے دوست متنبہ کر رہے تھے۔ کہ سلطان تمہارے خون کا پیاسا ہے تم ترکی سے نکل جاؤ۔ ایک یورپین دوست نے تو جہاز کی پیشکش بھی کی۔ لیکن مدحت پاشا اس خیال میں رہے کہ میں بے گناہ ہوں فرار اختیار کر کے بدگمانی کا موقعہ کیوں دوں نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ۱۷ مارچ کی شب میں ان کے مکان واقع سمرنا سے گرفتار کر کے قسطنطنیہ بھیج دیا گیا۔ قصر یلدیز میں ان کے علاوہ محمود پاشا اور نوری پاشا علیحدہ علیحدہ حجروں میں قید تھے۔ مدحت پاشا سے کہا گیا کہ تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ سلطان عبدالعزیز کی موت خودکشی سے واقع نہیں ہوئی بلکہ سلطان مراد کے حکم اور ان کی والدہ کے اشارے سے محمود پاشا اور نوری پاشا نے قتل کرایا ہے اور تم بھی اس قاتلانہ سازش میں شریک تھے۔ مدحت پاشا نے اس الزام کی سختی کے ساتھ تردید کی۔ ججوں کے سامنے بھی انہوں نے پوری تفصیل سے واقعات بیان کئے۔ اور انہوں نے تسلیم کیا کہ قتل کا کوئی ثبوت نہیں لیکن سلطان کا حکم تھا کہ یہ لوگ چھوٹنے نہ پائیں۔ عدالت نے گیارہ آدمیوں کو زبردستی مجرم قرار دیکر سخت سزائیں دیں۔ عدالت کے بعض ایماندار ارکان اس فیصلے میں شریک ہونے سے آخر وقت تک انکار کیا۔ ان

کی ایمانداری کا صلہ بھی دیا گیا اور وہ بھی ملزموں کی طرح قید خانے میں بھیج دیئے گئے۔

دوبارہ جلاوطنی:۔ سلطان نے مدحت پاشا کے ساتھ زبانی ہمدردی کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ ان کو انہوں نے مجبوراً جلاوطن کردیا۔ اور اپنا خاندان بھی ساتھ رکھنے کی "اجازت" دی۔ اور خطوط لکھنے کی رعایت بھی "بخشی" مگر پہلی بات پر عمل ہوا اور بعد کی دو باتوں کو پورا نہ ہونے دیا۔ ان کی جلاوطنی کا سانحہ بھی نہایت دردناک ہے ان کو جہاز "عزالدین" میں سوار کرکے نامعلوم مقام کی طرف روانہ کیا گیا۔ ان کے پاس پہننے کا ایک کپڑا بھی نہیں تھا جو کپڑے بدن پر تھے۔ وہی پہنے رہے۔ رستے میں انہوں نے اپنے خادم عارف کا کرتا مانگ کر پہنا اور اپنے ہاتھ سے اپنے کپڑے دھوئے اور جب تک وہ سوکھ نہ گئے اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ جہاز کئی روز کا سفر طے کرکے جدہ پہنچا۔ بحیرہ احمر کی گرمی نے ان کو اور ان کے رفقائے مصیبت کو بیمار کردیا۔ ان کے حجروں کے قریب ہی پاخانے تھے۔ بدبو سے ان کا دماغ پھٹا جاتا تھا۔ نوری پاشا حجاز جاتے ہی پاگل ہو گئے۔ حجاز میں پہنچ کر جہاز واپس چلا گیا۔ اور سرکاری قیدیوں کو طائف کے مشہور قید خانے میں داخل کردیا گیا۔ اثنائے سفر میں وہ مکہ معظمہ میں بھی ٹھہرائے گئے۔ لیکن نہ ان کو بولنے کی اجازت دی گئی نہ حرم شریف کی زیارت کا موقعہ دیا گیا۔

قید کے مشاغل:۔ طائف میں ان کو علیحدہ علیحدہ کوٹھریوں میں بند کردیا گیا ہر کمرے کے سامنے سپاہی ننگی تلواریں لئے پہرہ دیتے رہتے تھے۔ سلطان کا حکم تھا کہ یہ لوگ جلاوطن ہیں۔ ان کا خیال رکھا جائے کہیں بھاگ نہ جائیں۔ اس پر شریف مکہ نے کوٹھریوں کے روشن دان بھی بند کردیئے۔ لیکن خدا کا فضل شامل حال تھا۔ اس شدید نگرانی کے عالم میں بھی ان کو بیرونی دنیا سے منقطع نہ کیا جا سکا۔ قید خانے کے ڈاکٹر کو ان سے ہمدردی ہو گئی۔ اور اس نے ان کے خطوط کو ان کے خاندان کے افراد تک پہنچانے کی خدمت اپنے ذمے لے لی۔ اس کے ساتھ ہی لکھنے پڑھنے کا سامان بھی مہیا ہو گیا۔ اور مدحت پاشا نے نہ صرف قید و مصیبت کے ایام کی داستان قلمبند کرلی بلکہ اپنی خود نوشت سوانح عمری بھی مرتب کرلی۔

قید کے زمانے میں مدحت پاشا نے اللہ تعالیٰ سے لو لگا لی مشاغل حیات کی سیاسی نوعیت سے فرصت مل گئی تھی۔ اور قرآن کی تلاوت کا موقعہ مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے از سر نو قرآن حفظ کر لیا۔ شب و روز یاد خداوندی میں مصروف رہتے۔ اور صبر و استقامت کے ساتھ تمام مصائب کو برداشت کرتے۔ اس زمانے میں وہ اپنے رفقار کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ان میں سے جو ضرورت مند تھے۔ ان کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔ پہلے حکومت نے قیدیوں کے کھانے پینے کا ذمہ لیا تھا۔ بعد میں اس "احسان" سے بھی دستکشی اختیار کر لی۔ شریف مکہ عبد المطلب ایذا رسانی میں کوئی کمی نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کا بھی انجام یہ ہوا کہ ایک منگل کی شب میں ترکی فوجوں نے ان کا محل گھیر لیا۔ اور صبح کو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ شب خوابی کے کپڑوں میں قیدی بنا ہوا چلا آرہا ہے۔ یہ سو برس کا بوڑھا شخص انگریزوں سے سازش کی پاداش میں مارا گیا۔ اللہ اکبر ظلم کا انتقام خداوندی بھی کتنا شدید ہوتا ہے۔

سلطان کو ان لوگوں کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اور ان کے حکم سے طائف و مکہ کے حکام ہر امکانی ظلم روا رکھتے تھے۔ ان کے خدمت گاران سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ ایک شخص عمر بک نامی کو مدحت پاشا اور ان کے رفقار کی ایذا رسانی کے لئے خاص طور پر بھیجا گیا۔ یہ ایک کمینہ اور کم عقل شخص تھا۔ اس نے نوکروں سے کہا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ اپنی زندگی کیوں برباد کر رہے ہو۔ جب تک یہ زندہ ہیں تم بھی ان کے ہمراہ قید ہو۔ کیوں نہ تم ان کا خاتمہ کر دو اور اپنے اہل و عیال میں آرام کی زندگی بسر کرو لیکن نوکروں نے اس کی سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ عمر بک نے زہر دینے کی کئی مرتبہ کوشش کی اس نے نوکروں کو قید کر دیا۔ پھر سرکاری آدمیوں کے پہرے میں ان کو بازار جانے کی اجازت دے دی۔

موت کے لئے سازشیں:۔ قید کے دوران میں مدحت پاشا کئی مرتبہ بیمار ہوئے ایک مرتبہ تو دو پھوڑے نکل آئے ایک پیٹھ میں دوسرا پہلو میں۔ حکومت نے علاج کی طرف سے دانستہ بے پروائی برتی۔ بلکہ ان کے نوکروں کو بھی الگ کر دیا۔ ان

کا کھانا بھی عام قیدیوں کے ساتھ کر دیا۔ مقصود یہ تھا کہ کسی طرح وہ جلد ہلاک ہوں اور سلطان فکرمندی سے نجات پائے۔ لیکن زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے۔ اگر انسان کے بس میں ہوتی تو سلاطین و امراء دنیا کو برباد کر دیتے اور کسی انسان کی زندگی نہ بچتی۔ افسروں نے سب کچھ کیا۔ تاہم مدحت پاشا کے رفقاء نے پھوڑوں پر خود ہی مرہم بنا بنا کر لگا دیا۔ اور مدحت پاشا اسی سے اچھے ہو گئے۔ اس زمانے میں ان کو کھانے کی طرف سے بھی سخت تکلیف تھی۔ حکومت کی طرف سے صرف ایک برتن شوربے کا ملتا تھا۔ جس کو ۸ آدمی کھاتے تھے۔ شام کو مولی کے پتوں کا شوربا ملتا تھا۔ قیدی اس سلوک سے بہت ناتواں ہو گئے۔ رجب ۱۳۰۱ھ میں حکومت نے ان کو پھر زہر دینے کی کوشش کی ایک دن ان کے خادم عارف نے ایک افسر کے ذریعہ دودھ خریدا۔ افسر نے اس میں زہر ملا دیا تھا عارف نے پہچان لیا اور دودھ پھینک دیا۔ چند روز کے بعد عارف نے گوشت خرید کر مدحت پاشا کے لئے پکایا۔ وہ پکا کر ادھر گیا ہی تھا کہ اس میں زہر ملا دیا گیا۔ یہ حملہ بھی کارگر نہ ہوا۔ پھر صراحی کے پانی میں زہر ملا دیا گیا۔ ان واقعات سے قیدیوں کو یقین ہو گیا کہ موت قریب ہے۔ حکومت نے اس زمانے میں ایک چرکسی محمد بک نامی کو قتل کے لئے بھیجا تھا۔ یہ شخص طرح طرح کی ترکیبیں قتل کے لئے ایجاد کرتا تھا۔ لیکن موت اس کے بس کی نہ تھی۔ کہ اس کے طلب کرنے پر آ کر قیدیوں کا خاتمہ کر دیتی۔

مصائب کا خاتمہ

حکومت نے موت کی بالواسطہ تدبیروں سے مایوس ہو کر اب براہ راست قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تیسری بلٹن کا کمانڈر بکر آفندی چرکسی جو قیدیوں کا محافظ تھا چند ماہ کی غیر حاضری کے بعد قید خانے میں واپس آ گیا۔ اس کی واپسی کے چھٹے روز جب قیدیوں کے خادم حضرت عبداللہ بن عباس کی مسجد میں نماز ادا کرنے گئے۔ تو واپسی پر انہیں روک لیا گیا۔ اور ان کے آقاؤں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ عارف مدحت پاشا کی

علالت کے باعث شہر نہیں گیا تھا۔ اسے بعد میں زبردستی ہٹا دیا گیا۔ قیدیوں کو یہ بھی بتایا گیا کہ حکومت کی طرف سے آپ لوگوں کو اب کوئی رقم نہیں دی جائے گی۔ عام قیدیوں کا کھانا کھانا ہوگا۔ قلم دوات رکھنے کی بھی اجازت نہیں۔ خیر اللہ آفندی کی بیوی بھی اپنے قیدی خاوند کے قریب رہنے کے خیال سے طائف میں مقیم تھیں۔ حکومت نے ان کو بھی طائف سے نکال دینے کا حکم دے دیا۔

قیدیوں نے یہ "طیاریاں" سنیں تو سمجھ گئے کہ آخری وقت قریب ہے۔

مدحت پاشا شجاعت و استقلال میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ وہ ان تمام حوادث سے مطلقاً پریشان نہیں ہوئے۔ بلکہ ان کو ایک گونہ مسرت تھی۔ کہ انسانی ظلم و استبداد سے نجات پاکر وہ اپنے رب رحیم سے جا ملنے والے ہیں۔ وہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے۔ وظائف و اوراد کا ورد رکھتے تھے۔ تلاوت قرآن سے تسکین روح اور اطمینان قلب حاصل کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ جو کچھ کر سکتے ہیں شوق سے کر گذریں زیادہ سے زیادہ قتل کر سکتے ہیں۔ اور قتل و شہادت ہمارے لئے سعادت دارین کا ذریعہ ہے انہوں نے والی حجاز کو بھی کمانڈر بکر آفندی کی وساطت سے انتباہاً پیغام بھیجا کہ تم جو ظلم کر رہے ہو ان کا انجام اچھا نہیں ہے۔ تم سمجھتے ہو ان حرکات سے سلطان خوش ہو کر انعام و اکرام عطا کرے گا۔

مدحت پاشا کا جسورانہ انتباہ: لیکن تم یاد رکھو کہ تمہاری خدمات مدحت پاشا کی خدمات سے زیادہ نہیں ہو سکتیں۔ جب سلطان نے ان کی خدمات کا صلہ دینے میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے تو تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ دیکھو سروری آفندی نے ہمیں سزا دی تھی۔ سلطان نے اس کو "قاضی عسکر" بنا دیا مگر اب وہ مگنیسا میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے جودت پاشا نے ہمیں گرانے میں سلطان کی امداد کی لیکن اب وہ قید و ذلت کی زندگی بسر کر رہا ہے وہ اپنے گھر کی چاردیواری میں نظر بند ہے۔ غور کرو اور خدا سے ڈرو تم مسلمان ہو اور اللہ تعالیٰ نے مسلمان پر قرآن مجید میں مسلمان کا قتل کرنا حرام کیا ہے۔ ومن یقتل مومناً متعمداً فجزاءہ جھنم خالداً فیھا وغضب اللہ

علیہ ولعنہ واعدلہ عذاباً عظیماً۔ جہنم کا خلود غضب الٰہی اور لعنت خداوندی اور عذاب عظیم اس شخص کی سزا ہے جو مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے۔

اس واقعے کے سات دن بعد بکر آفندی واپس آیا۔ اور کہا کہ سلطان نے حکم دیا ہے قیدیوں کے نوکروں کو واپس قیدیوں کے پاس بھیج دیا جائے۔ اور ان کو ہر طرح آرام سے رکھا جائے۔ اس دوران میں مدحت پاشا کی صحت اچھی ہو گئی تھی۔ لیکن ان کی صحت مندی ہی سب سے بڑا خطرہ تھی۔ حکومت ان کو ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی اور ان کی بحالی صحت کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی تھی۔ ایک روز مدحت نے سپاہی سے دودھ منگایا ایک افسر نوری آفندی تلوار لے کر ساتھ ہو گیا اور بڑی مستعدی سے دودھ لے آیا لیکن جب پتیلی کھولی تو دودھ کا رنگ متغیر تھا۔ سعید بک نے ایک چمچہ دودھ زبان پر رکھا۔ تمام منہ کڑوا ہو گیا۔ معلوم ہوا زہر ملا دیا گیا ہے جس شخص نے دو قطرے بھی نگل لیے بیہوش ہو گیا بعد میں معلوم ہوا کہ کمانڈر اپنے سپاہیوں سے پوچھ رہا تھا کہ قیدیوں نے دودھ پی لیا تھا۔ اس واقعے کے بعد زیادہ احتیاط ہونے لگی۔ باورچی خانے کا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا جاتا تھا۔ کھانے پینے کے برتنوں پر علامتیں لگا دی جاتی تھیں۔ لیکن دو ہفتہ کے بعد جونہی عارف نے دروازہ کھولا برتنوں سے علامتیں ہٹی ہوئی تھیں۔ باسی کھانے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ معلوم ہوا زہر ملا دیا گیا ہے بعد میں مش آغا اور نوری آفندی نے اعتراف کیا کہ انہوں نے فی الواقعہ زہر ملایا تھا۔ ایک روز صراحی میں زہر ملا دیا گیا۔ معلوم ہونے پر صراحی توڑ دی گئی۔ تحقیقات پر پتہ چلا کہ زہر مصر سے مہیا کیا جاتا ہے لانے والا ایک شخص اسمٰعیل آغا ہے۔

لیکن زہر دینے کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ بالآخر (۱۳ مارچ) ۱۳۰۱ھ کو رسالدار محمد لطفی دو رجمنٹ فوج اور توپخانہ لے کر مکہ معظمہ سے آیا اور قلعہ کے محافظوں میں اپنے پاس سپاہی داخل کر دیئے۔ اس نے سب سے پہلے تو آتے ہی مدحت پاشا کے خادم عارف آغا کو گانٹھنے کی کوشش کی۔ اور کہا کہ اگر تم مدحت پاشا کے قتل کرنے میں میری امداد کرو تو تمہیں ایک ہزار پونڈ انعام دیا جائے گا۔ عارف نے زہر لے لیا اور آ کر اپنے آقا کو پوری حقیقت

حال کہدی۔

ایک روز محمد لطفی نے عارف سے کہا کہ آج رات کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دینا۔ دیکھو اگر دروازہ بند کروگے تو تمہارا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ لیکن عارف نے آکر قیدیوں کو اطلاع دے دی اور کہا کہ آج رات آپ لوگ جدا نہ ہوں یہ لوگ چھرا لے کر قتل کرنے آئیں گے۔ اس کی خبر افسروں کو ہوگئی۔ انہوں نے عارف کو گرفتار کر کے قیدیوں سے منتشر ہوجانے کا حکم دیا۔ لیکن قیدیوں نے اطاعت کرنے سے انکار کردیا۔ بکر آفندی یہ دیکھ کر قلعے سے باہر چلا گیا۔

وفات:۔ ۲۰ رجب ۱۳۰۱ھ کو مدحت پاشا اور داماد محمود پاشا کو استبداد نے موت کے گھاٹ اتار کر اس جگہ پہنچا دیا۔ جہاں ظلم واستبداد کا ہاتھ بھی نہیں پہنچ سکتا۔

اسی رات میں قلعے کے اندر بہت سی فوج جمع کردی گئی۔ سپاہیوں کو کافی مقدار میں کارتوس دے دیئے گئے۔ آدھی رات کے بعد محمود پاشا کے خادم حاجی شکری کو جگا کر پکڑ لے گئے۔ پھر ہر قیدی کے کمرے کے سامنے دو دو مسلح سپاہی کھڑے کر دیئے گئے۔ مدحت پاشا کا خادم پہلے ہی قید کر دیا گیا تھا۔ ان کے کمرے میں عزت نامی پاشا کے لڑکے علی بک سو رہے تھے۔

اچانک مدحت پاشا کے کمرے کا دروازہ توڑ کر کھول ڈالا گیا۔ سپاہی علی بک کو اٹھا کر لے گئے۔ مدحت پاشا کو قتل کرنے لگے تو انہوں نے نصیحت کی عذابِ خداوندی سے ڈرایا اور کہا کہ سپاہی کا کام وطن کی حفاظت کرنا ہے۔ ارتکاب جرم نہیں ہے۔ لیکن ان کا گلا گھونٹ کر ان کو شہید کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قاتلوں نے محمود پاشا کے کمرے کا دروازہ بھی توڑ ڈالا لیکن انہوں نے خاموشی سے قتل ہونا قبول نہ کیا۔ اور تکیے اٹھا کر دیر تک مقابلہ کرتے رہے جب تھک گئے تو محمد آغا ایک افسر نے رسی کا پھندا گلے میں ڈال ان کو شہید کر دیا خیر اللہ آفندی پاس کے کمرے میں تھے۔ وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے، لیکن سپاہیوں نے کہا آپ کے لئے کوئی اندیشہ نہیں۔ مگر وہ اس قدر ڈر گئے تھے کہ رات بھر بیہوش پڑے رہے۔ محمود پاشا

جن کے ساتھ کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہونی چاہیے۔

سر ہنری ایلیٹ کی یادداشت: دنیا نے اس الزام کو ایک عرصہ تک صحیح تسلیم کیا۔ لیکن جب سر ہنری ایلیٹ انگریزی سفیر مقیم استانبول نے ۱۸۸۸ء میں اپنی یادداشت شائع کی اور جس میں مدحت کو بے قصور ثابت کیا تو پہلی مرتبہ دوسرا نقطہ نگاہ دنیا کے سامنے آیا۔ پھر بھی اس نے ان کی بے قصوری پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے احتراز کیا۔ کہا گیا کہ مصنف نے اپنی دوستی کا حق ادا کیا ہے۔

دور حمیدی کی بدحواسیاں: ہندوستان کے اردو اخبارات میں تو مدحت کو باغی مدحت لکھا گیا۔ کلکتہ کے اردو گائڈ اور لاہور کی اخبار "انجمن پنجاب" نے "باغی مدحت" کی سزایابی کی اطلاعیں طمطراق سے شائع کیں۔ پھر جب مدحت سزایاب ہو کر قید ہو گئے اور پھر قتل کر دیئے گئے۔ تو دنیا ان کو فراموش کر چکی تھی لیکن مظلوم کا خون رائیگاں نہیں جا سکتا تھا۔ سلطان کو مدحت کے نام سے کد تھی۔ ان کا اور ان کے رفقاء کا نام لینا بھی جرم تھا۔ جہاں تک کہ بھی کتابوں کی اشاعت محض اس لئے صیغہ احتساب نے روک دی کہ ان کے مصنفوں کا نام "مدحت" تھا۔

سلطان نے ترکی اور بیرون ترکی بہت سے اہل قلم کی خدمات حاصل کیں۔ قسطنطنیہ کا اخبار "صباح" انکو دین مفسدین کا دشمن قرار دینے میں سب سے پیش پیش تھے انگلستان میں بے دریغ روپیہ خرچ کیا جا رہا تھا۔

۱۹۰۳ء میں ایک کتاب انگلستان کی ایک شہزادی کی ذاتی تحقیقات سے منسوب کر کے شائع کی گئی اس میں بھی حمیدی روایات کا کام کر رہی تھی۔ اور سر ہنری ایلیٹ کے مضامین کا جواب دینے کے لئے طبع کی گئی تھی۔

حقیقت حال کا افشا: لیکن حقیقت مظلوم پر زیادہ عرصہ عنایت اور پروپیگنڈا کا پردہ نہیں ڈالا جا سکتا تھا جب مدحت کا لڑکا علی حیدر بیگ جوان ہوا تو اس کی ماں نعیمہ خانم نے اس کے مظلوم باپ کی "آخری امانت" اس کو سپرد کی۔ یہ امانت ایک نامکمل خودنوشت سوانح عمری تھی۔ اور چند خطوط جو طائف کے قید خانے سے لکھے گئے تھے۔

طائف کا ایک فوجی ڈاکٹر مخزی بے قیدیوں سے ہمدردی رکھتا تھا اس زمانے

میں مصر کے خاندان خدیوی کی ایک امیرزادی بیگم صفوت پاشا مکہ معظمہ میں مقیم تھی۔ اور اپنے دولت و ریاست کے باعث شریف مکہ اور گورنر حجاز پر بہت اثر رکھتی تھی۔ اس نے فخری بے کو آمادہ کیا کہ قیدیوں کے خطوط لے کر مکہ معظمہ پہنچا دیا کرے۔ اس کو قید خانے میں جانے کی اجازت دی۔ اس نے خطوط لیکر مدحت کے گھر والوں تک پہنچا دیئے۔ اور دنیا حقیقت حال سے واقف ہو گئی۔

مدحت پاشا کی سوانح عمری نامکمل نوشتہ تھی۔ تاہم علی حیدر نے اسی کی امداد سے مدحت پاشا کی سوانح حیات قلمبند کی یہ کتاب پیرس میں ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی اور دنیا پہلی مرتبہ اصل حقیقت سے آشنا ہوئی، اور کذب و افترا کے وہ تمام پردے چاک ہو گئے۔ جو سلطان عبدالحمید کی چالاکی اور ریشہ دوانی کی کارفرمائی نے ڈال رکھے تھے۔ شہید مظلوم کا دامن شہرت و عزت بیس برس کے بعد الزامات کے داغ سے پاک ہوا۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب دستور کے بعد ترکی اخبارات نے یہ خبر شائع کی کہ طائف کے ایک باغ سے وہ آہنی صندوق نکلا ہے جس میں مدحت پاشا کی خود نوشت سوانح عمری محفوظ تھی۔ معلوم ہوا کہ مدحت پاشا نے اپنی کتاب مکمل کر لی تھی۔ اور اس کی دو نقلیں بھی کرا لی تھیں۔ اصل نسخہ بدفعات مصر کو بھیج دیا گیا۔ اور نقل صندوق میں دفن ہو کر محفوظ ہو گیا۔ جسے قدرت کے ہاتھ نے ۱۹۰۸ء میں نکالا۔ بعد میں یہ نسخہ صفی آفندی مدیر اوراق طائف کے پاس پہنچا وہ مدحت سے ہمدردی رکھتے تھے انہوں نے نسخہ ایک آہنی صندوق میں رکھ کر زمین کے حوالے کر دیا۔

علی حیدر بے انقلاب کے بعد قسطنطنیہ آ گیا تھا اس نے اس نسخے کی امداد سے ایک نئی کتاب مرتب کی۔ اور مدحت پاشا کی خود نوشت سوانح مکمل صورت میں دنیا کے سامنے آ گئی۔ اور جہاں سلطان عبدالحمید کے اعمال کے چہرے سے حقیقت کا پردہ اُٹھا وہاں شہید حریت و دستور مدحت کی قربانی اور اولوالعزمی کا حال بھی معلوم ہو گیا۔

مدحت کی زندگی اور فداکارانہ حیات میں ان محبان وطن کیلئے عبرت و موعظت کا درس پنہاں ہے۔ جو اپنے ملکوں کو استبداد و ظلم سے نجات دلانا چاہتے ہیں ۔

سعد زاغلول پاشا

ابتدائی حالات:- مصر کا یہ جلیل القدر سیاست دہندہ بللہ ابیانہ میں ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوا۔

تعلیم و تربیت:- جب سات برس کی عمر ہوئی۔ تو باپ نے قصبہ کے مڈل سکول میں داخل کر دیا۔ آپ نے پانچ سال تک قرأت خطابت کی تعلیم حاصل کی پھر دسوق پہنچے۔ اور وہاں کے مشہور شیخ عبداللہ عبدالعظیم سے تجوید کا علم سیکھا پھر مصر کی سب سے بڑی درسگاہ جامعہ ازہر میں داخل ہوئے۔ یہاں پانچ سال تک تحصیل علوم میں مشغول رہے۔ فراغت پر سیاحت کی طرف راغب ہوئے۔ انہیں دنوں سید جمال الدین افغانی جنہیں تحریک حاضرہ کا محرک اوّل کہنا چاہئے۔ قاہرہ میں رونق افروز تھے۔ اور باہر کے تشنہ کامان حریت آتے ہی سب سے پہلے ان کی اور ان کے شاگردان رشید شیخ محمد عبدہ علامہ بلبادی جاجوری اور عبدالکریم سلیمان وغیرہم کی ملاقات سے بہرہ اندوز ہوتے تھے

اس مصلح اعظم کو آخری وقت میں بھی سب سے زیادہ خوف اسی مصیبت کا تھا۔ جو روش اور ہیٹ کی طرف سے نہیں۔ بلکہ عمامہ و دستار کے پیچوں سے نکل کر تمام عالم اسلامی پر چھائی ہوئی ہے۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں شیخ محمد عبدہ نے ارادہ کیا تھا۔ کہ اصلاح و ارشاد کی خاطر تمام عالم اسلامی کا دورہ کریں۔ چنانچہ وہ پہلے مراکو پھر ٹیونس گئے۔ اور وہاں سے واپس آکر ہندوستان آنے کے لئے اسکندریہ میں مقیم تھے۔ کہ امر الٰہی نے اس نفس مطمئنہ کو ارجعی الی ربك راضیة مرضیة (۸۹ : ۲۸) کا پیغام پہنچایا۔ اور یہ دو شعر پڑھتے ہوئے جو ان کی زندگی اور امید و آرزو کا خلاصہ تھے رگزائے عالم جاودانی ہوئے۔

ولست ابالی ان یقال محمد ابل او اکتظت الیه الماتم
ولکن دینا قد اردت اصلاحه احاذر ان تقضی علیه العمائم

سید جمال الدین افغانی سے تعلقات :- زاغلول پاشا نے بھی مدرس توحید کا استفادہ شیخ محمد عبدہ سے کیا تھا۔ اب بھی قسمت آزمائیں رہنے لگیں۔ جس سے زاغلول جیسا دماغ بغیر متاثر ہوئے نہ رہ سکا۔ مدرسہ تعلیم [illegible] میں بہت ترقی کی۔ کہ وہ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو مصر کے مشہور جریدہ الوقائع المصریہ کے نائب مدیر آٹھ سو قرش ماہوار مدیر مقرر ہوئے جس کو [illegible] تک نہایت کامیابی کے ساتھ چلاتے رہے۔ استبداد کے خلاف زبردست مقالات لکھے جنہوں نے زاغلول پاشا کی قابلیت اور وسعت معلومات کا سکہ بٹھا دیا۔ [illegible] ۱۸۸۲ء کو آپ کی تنخواہ [illegible] قرش ہو گئی۔ اس تقرر سے پہلے زاغلول پاشا نے ازہر کی [illegible] کتب کی تعلیم [illegible] اور اس کے اکثر حصہ کو طے بھی کر چکے تھے۔ [illegible] اور [illegible] جیسے [illegible] معروف اخبارات نے زاغلول پاشا کے اکثر مضامین شائع کیے۔ [illegible] قوم پرستوں کو جھنجھوڑ دیا گیا تھا۔ ان مضامین نے آپ کی شہرت کو اور بھی چار چاند لگا دیے اور زاغلول پاشا علمی اور سیاسی حلقوں میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہو گئے۔

ملکی خدمات :- ۳ مئی ۱۸۸۲ء کو نظارت داخلیہ میں اسسٹنٹ بنائے گئے۔ ستمبر ۱۸۸۲ء میں [illegible] کی [illegible] میں دفتر کاغذات سرکاری کے محافظ مقرر ہوئے اور یہاں تک ترقی کی کہ محکمہ قضا کے وزیر نامزد ہو گئے۔ اور اسی منصب جلیلہ پر سرفراز ہوئے۔ ابھی دو ماہ سے زیادہ مدت نہ ہوئی تھی کہ ۱۸۸۲ء میں مصر میں تحریک وطنی کا آغاز ہوا۔ جس کے سرگروہ احمد عرابی پاشا مشہور قوم پرست تھے جنہیں بعد میں گرفتار کر کے سیلون بھیج دیا گیا۔ اور جو وہیں انتقال فرما گئے۔ زاغلول پاشا پر بھی الزام لگایا گیا کہ وہ بھی اس تحریک میں شامل تھے۔ حکومت نے ان کو تو کوئی سزا نہ دی۔ مگر وزارت سے علیحدہ کر دیا۔ پھر ان پر اتہام لگایا گیا۔ کہ وہ جمعیت الانتقام میں شامل ہیں۔ جو ایک خفیہ انجمن تھی۔ مگر تحقیق کے بعد وہ بے گناہ ثابت ہوئے۔

قانونی خدمات :- سعد زاغلول وکیل نہ تھے مگر وکالت کی [illegible] حالی سے متاثر ہوئے اور

تعلیمات مقرر ہوئے۔

سنہ ۱۸۸۲ء سے جنگ یورپ کے آغاز تک برطانیہ مصر پر برائے نام قبضہ کیے ہوئے تھا۔ مگر ترکی کے اعلان جنگ کے ساتھ ہی انگریزوں نے مصر کو اپنی سلطنت کا جزو بنالیا۔ عباس حلمی پاشا (خدیو مصر) جو ترکی حکومت کا زبردست حامی تھا۔ انگریزی حکومت کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر مصر سے ترکی چلا گیا۔ زاغلول پاشا نے حالات حاضرہ پر پُرجوش مضامین لکھے۔ اور وہ قوم جیسے مصطفےٰ کامل کی وفات کے بعد ایک نئے قائد کی تلاش تھی۔ سعد زاغلول کے جذبہ ملّی کی قدر کرنے لگی۔

سعد کے مضامین نے ملک میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ مگر اخبارات پر محکمۂ احتساب کے قیام کے بعد انہیں مجبوراً خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ لیکن خاموشی کا زمانہ انہوں نے بیکار نہ جانے دیا جس طرح ان کے استاد شیخ محمد عبدہ نے اپنی جلاوطنی کے ایام پیرس جاکر فرانسیسی زبان سیکھ لی تھی۔ اور پھر اسی کے ذریعہ سے فرانسیسی قوم کو مصری حالات کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ اسی طرح آپ نے قاہرہ ہی میں جرمن زبان سیکھ لی۔ فرانسیسی زبان میں وہ اس سے قبل دسترس حاصل کر چکے تھے۔ پچاس ساٹھ برس کی عمر میں ایک غیر ملکی زبان سیکھ لینا ان کی ہمت اور قوت ارادہ کا پتہ دیتا ہے۔

قومی خدمات: سعد زاغلول پاشا کی قومی زندگی کا دور ۲۳ جنوری ۱۹۲۵ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ وہ مجلس قوانین کے پہلی دفعہ پریذیڈنٹ منتخب ہوئے۔

زور خطابت: جن لوگوں نے اس مجلس کے جلسوں میں ان کی تقاریر سنیں وہ ان کے طریق مناقشہ کی فضیلت، ان کے طریق خطابت کی بلاغت اور ان کی قادر الکلامی کا لوہا مان گئے۔ وہ اس لحاظ سے یورپ کی مجالس نیابت کے ماہرین کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل تھے۔ جنہوں نے اپنی زندگیاں آئین کی ادھیڑ بن میں صرف کر دیں۔ سعد پاشا جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے۔ تو لوگوں کی نظریں ان پر گڑ جاتی تھیں۔ ان کی زبان سے فصاحت و بلاغت کے موتی جھڑتے تھے جنھیں لوگ آویزۂ گوش ہوش بنانے میں نہایت مستعد رہتے تھے۔ جب وہ مجلس قوانین

میں تقریر کرتے تھے۔ تو ان کے علم دوست ساتھی ان کی اس غیر معمولی وسعت معلومات پر عش عش کرتے۔ اور بے اختیار پکار اٹھتے۔ کہ یورپ کی مگر پارلیمنٹوں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں قدرت کی طرف سے سعد جیسی گویائی عطا ہوئی ہے۔ ان کے دوست ان پر جان قربان کرتے تھے۔ اور دشمن ان کا ادب کرتے تھے۔

حکومت کے وعدے:۔ حکومت برطانیہ نے حسین پاشا کی تخت نشینی اور رشدی پاشا کی وزارت کا اعلان کرتے ہوئے۔ باشندگان مصر سے اس بات کا بھی وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر برطانیہ کی فوجی نقل و حرکت میں مصری مزاحم نہ ہوئے۔ تو جنگ یورپ کے اختتام پر انہیں آزادی دے کر مصر کے حقوق تسلیم کر لئے جائیں گے۔ چنانچہ سلطنت کے ان مواعید پر بھروسہ کر کے اہل مصر نے دوران جنگ میں انگریزوں کی ہر طرح امداد کی مصری آبادی کا تیرھواں حصہ یعنی دس لاکھ آدمی فوجی ضرورتوں کے لئے میدان جنگ میں پہنچے مگر اس کا صلہ کیا ملا۔ اس کے لئے اہل مصر کی چیخ و پکار۔ فوجی حکومت کا قیام محکمہ احتساب کی سخت گیریاں اور اسی قسم کے دیگر مصائب پر ایک سرسری نظر ڈال لیجیے۔

سفر لنڈن:۔ یہ جنگ ختم ہوئی۔ تو سکون ہوتے ہی سعد زغلول پاشا اعیان امت مصریہ میں سے جانبازان حریت کی ایک جماعت لے کر ۱۳ نومبر ۱۹۱۸ء کو عازم لنڈن ہوئے۔ غرض یہ تھی۔ کہ ارباب سلطنت برطانیہ کے کانوں تک مصری قوم کے مطالبات پہنچا دئے جائیں۔ اور پھر سارے یورپ کا سفر کیا جائے۔ تاکہ دنیا کے بڑے بڑے مدبرین سے مسئلہ مصر پر گفت و شنید کی جائے۔ مگر برطانوی حکومت نے اجازت نہ دی اس پر تمام مصر میں عظیم الشان مظاہرے ہوئے۔ ہڑتالیں ہوئیں۔ اور ملک میں سیاسی بیداری کی ولولہ انگیز لہریں اٹھنے لگیں۔ تمام ملک میں تحریک عدم تعاون کا آغاز کر دیا گیا۔

صدائے احتجاج:۔ زغلول پاشا کی زعیمانہ زندگی کا آغاز ۲ فروری ۱۹۱۹ء ہوتا ہے برطانیہ نے مصر میں فوجی قانون نافذ کرنے کے بعد غاصبانہ طور پر اسے اپنی قلمرو

میں ملحق کر لیا تھا۔ سعد زغلول پاشا نے ایسے عجیب اور نازک دور میں اپنی آواز حریت انگریزی قبضے کے خلاف بلند کی۔ اور مصری سیاسی بیداری کی صبح کا اعلان کر دیا۔ آپ نے اپنی پہلی سیاسی تقریر میں کہا:۔

"ہمارا ملک خود مختار ہے۔ ۱۸۴۰ء کے معاہدہ لندن میں اس کا اعتراف کیا جا چکا ہے۔ جنگ کے زمانہ میں جو سیاسی تبدیلی کی گئی ہے۔ اس کا ذکر بیکار ہے۔ کیونکہ تمام علمائے قانون کا متفقہ فیصلہ ہے۔ کہ انتداب و نگرانی کا وجود اس وقت جائز ہو سکتا ہے جب ایک قوم دوسری قوم سے اس کی حفاظت میں رہنے کی خواہش کرے۔ لہٰذا وہ ایک سمجھوتہ یا عہد نامہ ہے جس میں جانبین کی قبولیت بنیادی شرط ہے لیکن مصر میں اس طرح کی کوئی بات کبھی پیش نہیں آئی۔ اور نہ قیامت تک پیش آ سکتی ہے۔ ۱۹۱۴ء میں برطانیہ نے از خود حفاظت کا اعلان کر دیا۔ لیکن مصر نے اسے قبول نہ کیا۔ لہٰذا یہ حفاظت سراسر باطل ہے۔"

گرفتاری:۔ آخر ۸ مارچ ۱۹۱۹ء سعد زغلول پاشا اور ان کے ساتھ تین وفد کے ارکان مسٹر محمد محمود پاشا، اسمٰعیل صدقی پاشا اور احمد الباسل پاشا کو مالٹا میں جلا وطن کیا گیا۔ اس حکم نے تمام ملک میں ہلچل ڈال دی مصریوں کے دلوں میں حکومت برطانیہ کے خلاف جذبات تو پہلے ہی موجزن تھے۔ اب ان عظیم رہنماؤں کی گرفتاری نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ مصر کے طول و عرض میں مظاہروں اور شورشوں کا لا متناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ گورنمنٹ نے ہنگاموں کے فرو کرنے کے سلسلے میں سب سے پہلے اس قسم کی شورشوں کو دبانے کی کوشش کی۔ ان دنوں مصر میں قتل و غارت قید و بند اور مار پیٹ ایک معمولی بات تھی۔ بہت سے سرکاری عہدیداروں نے احتجاج کے طور پر استعفے داخل کر دیئے۔ انگریزوں کے ملازموں تک نے ہڑتال کی۔ اور طلبہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

رہائی:۔ اہل مصر کی مساعی خالی نہ گئیں اور یہ حضرات ۷ اپریل ۱۹۱۹ء کو رہا کر دیئے گئے۔ رہائی کے بعد ارکان وفد نے پیرس کا ارادہ کیا۔ اور باوجود مخالفت کے

اپنی مہم کو خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ یورپ اور امریکہ میں ان کی آواز کو بہت
تقویت دی گئی۔ مصر میں واپس آئے۔ اور پھر اپنی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

عیسائی مسلم اتحاد: سعد کی کوششوں کا بہترین نتیجہ عیسائیوں اور مسلمانوں کا باہمی
اتحاد تھا۔ اس سے قبل ان دونوں قوموں میں ہمیشہ نا چاقی اور دشمنی رہا کرتی تھی لیکن وطن
پرستی کی مبارک جدوجہد میں وہ پرانی عداوتوں کو بھول کر آپس میں شیر و شکر ہو گئے چنانچہ
۱۹۲۱ء میں مصری وفد کے نمائندے عبداللطیف بے نے پارلیمنٹ اٹلی میں تقریر کرتے
ہوئے کہا تھا۔ کہ ہمارے مطالبات ٹھکرا دئیے جانے پر عیسائیوں اور مسلمانوں میں ایسا
اتحاد ہو گیا ہے جس کی نظیر دوسرے ممالک میں نہیں ملتی۔ مسجدوں میں عیسائی پادری
لیکچر دیتے ہیں۔ اور گرجا گھروں میں وحدت کے ترانے سنائے جاتے ہیں۔"

خواتین کا جذبہ آزادی: زغلول پاشا کی ہمہ گیر شخصیت آخر عورتوں
کو بھی میدان عمل میں لے آئی۔ اور اونچے طبقے کی مستورات حب وطن کے جوش
میں پردے کی چار دیواری سے باہر نکل آئیں۔ عورتیں باقاعدہ جلوس میں قطار باندھ
کر چلتی تھیں۔ بہت سی پیدل اور بہت سی گاڑیوں میں سوار ہو کر آزادی مصر کے
نعرے بلند کرتی تھیں۔ جو لوگ لڑائیوں اور شورشوں میں مارے جاتے تھے۔ ان کے
جنازوں کے ساتھ ہزارہا عورتیں ماتم کرتی جاتی تھیں۔ ملنر کمیشن کی آمد پر مصری عام
ہڑتال کے زمانہ میں جب سرکاری حکام نے اسٹرائیک کی۔ تو مستورات کی چھوٹی
چھوٹی جماعتیں دفاتر کے مکانوں کے آس پاس متعین ہو گئیں۔ تاکہ اگر کوئی وہاں
جانا چاہے۔ تو اس کو روکیں

عدلی پاشا کا وفد: عدلی پاشا جو اعتدال پسند پارٹی کے ہمنوا تھے۔ یکم
جولائی ۱۹۲۱ء کو ایک سرکاری وفد لے کر آزادی مصر کی بھیک مانگنے کے لیے انگلستان
روانہ ہوئے۔ اہل مصر نے ہر قسم کے مظاہرے کر کے اس بات کا اعلان کر دیا۔ کہ اس
وفد کا قوم سے کوئی تعلق نہیں۔ سعد کے خود ساختہ نمائندے لندن پہنچے۔ لارڈ کرزن
سے گفت و شنید کی۔ آخر ناکام مصر واپس آگئے اور حکومت مصر جو تحریکات

کو کچلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ زاغلول اور اس کی جماعت کی طرف متوجہ ہوئی۔

عزیز حسن پاشا :۔ شہزادہ عزیز حسن پاشا زاغلول پاشا کا بہت بڑا حامی مصر کی آزادی کے لئے سرکیف شامل رہا۔ آپ کے مستحکم خیالات اور غیر متزلزل ارادوں اور حیرت انگیز اخلاقی جرأت سے زاغلول پاشا کو بڑی مدد ملا کرتی تھی۔ اس پاداش میں وزارت مصر نے اس محب وطن شہزادہ کو جلاوطنی کا حکم دے دیا۔

اخبار پر احتساب :۔ شہزادہ کی جلاوطنی کے بعد حکومت مصر نے زاغلول پاشا کے اخبار کی طرف توجہ کی۔ جو اپنی پرجوش تحریروں سے ملک میں ہلچل پیدا کر چکا تھا۔ چنانچہ وزارت کے حکم سے یہ اخبار چھ ماہ کے لئے بند کر دیا گیا۔

سعد پاشا کا سفر اور مصر میں افسوسناک فساد :۔ اخبار کی بندش اور اپنے رفیق کی جلاوطنی کے بعد زاغلول پاشا خود قاہرہ سے نکلے۔ دریائے نیل کے بالائی علاقہ میں مقام رسیوت پہنچے۔ اکتوبر کو آپ کے رفقا اور عدلی پاشا کے حامیوں میں جھڑپ ہو گئی۔ پتھر لاٹھی اور گولیاں تک چلیں۔ جس سے ایک آدمی ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔ حکام نے مزید فساد کے خوف سے زاغلول پاشا کو خشکی پر اترنے کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے جہاز پر ہی تقریر شروع کر دی۔ اور لوگوں کو امن وامان قائم رکھنے کی صلاح دی۔ یہاں سے مقام سوہاج پہنچے۔ جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ مگر حکومت نے مجلس استقبالیہ کو مشورہ دیا۔ کہ وہ جہاز پر ہی سعد سے ملاقات کر لیں۔ ۲۰ اکتوبر کو مقام فرقوط پہنچے۔ یہاں پولیس اور جمہور میں لڑائی چھڑ گئی۔ ۵۰ اشہر والے اور ۹ پولیس کے آدمی مجروح ہوئے۔ ان حالات سے متاثر ہو کر حکومت نے زاغلول پاشا کو سفر جاری رکھنے کی اجازت نہ دی۔ اور وہ واپس قاہرہ تشریف لے آئے۔

مصر میں تحریک ترک موالات :۔ قومی تحریک کو تقویت دینے کے لئے زاغلول پاشا کی زبردست شخصیت ہی کچھ کم نہ تھی۔ کہ ۵۰ کے قریب مصر کے مشہور و معروف علماء نے اپنے دستخطی اعلان سے ان کی تحریکات کی اشاعت و تبلیغ کو اور قوت بخش دی چنانچہ انگریزوں سے عدم تعاون اختیار کرنے اور انگریزی مال کے بائیکاٹ کے متعلق

عربی زبان میں ایک پمفلٹ شائع کیا گیا جس پر سعد کے علاوہ آٹھ دیگر رہنمایانِ قوم کے دستخط ثبت تھے۔ اس مختصر رسالہ میں نہایت پرجوش الفاظ میں مندرجہ ذیل امور پر زور دیا گیا:-

۱۔ انگریزوں کے ساتھ کسی قسم کا معاشرتی مجلسی تعلق نہ رکھا جائے۔
۲۔ انگریزی بنکوں سے اپنا روپیہ واپس لے لیا جائے۔
۳۔ اپنے معاملات کو انگریزوں کی بجائے مصری حکام کے سامنے پیش کیا جائے
۴۔ انگریزی جہازوں کے ذریعہ مالِ تجارت نہ بھیجا جائے۔
۵۔ انگریزی سامان کو مصری مزدور جہازوں سے نہ اتارا کریں
۶۔ انگریزی مال کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔

اس کے علاوہ ۲۲ دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو زغلول نے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ترکِ موالات کا اعلان کیا۔ اور اہلِ مصر کو ہندوستان کے نمائندہ اہنسا گاندھی جی کے ارشاد کی پیروی کرنے کی ہدایت کی۔ اس تقریر پمفلٹ اور علماء کے اعلان سے قاہرہ کے گردونواح میں اسقدر جوش پھیلا۔ کہ کسی مغلوب الغضب مصری نے رات کے وقت بازار میں چلتے ہوئے دو گوروں پر گولی چلادی جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔

حکومتِ برطانیہ لارڈ ایلن بائی اور برطانوی فوجی افسر گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون اس کے خوفناک نتائج اور ہندوستان کی موجودہ بےچینی کے حالات سے آگاہ تھے چنانچہ اس خیال سے کہ کہیں مصر میں بھی یہ تحریک عام ہو کر حکومت اور اس کے متعلقات کے لیے تباہ کن ثابت نہ ہو۔ انہوں نے اسے شروع ہی میں دبانے کا فیصلہ کیا۔ لارڈ ایلن بائی نے اس سیلاب کو روکنے کے لئے فوراً فوجی قانون کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ قاہرہ کے اندر باہر ہر طرف فوجی حکومت ہو گئی۔ بڑے بڑے اعلان کئے گئے۔ توپ سر ہونے کے بعد بازاروں میں نکلنے کی ممانعت ہو گئی۔ فوج کو اختیار دیا گیا۔ کہ جب ضرورت پڑے بلا تامل گولی چلادے۔ مارشل لاء کے ساتھ ہی قاہرہ اور اسکندریہ کے ان تمام اخبارات کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی جنہوں نے زغلول پاشا کا پمفلٹ شائع کیا تھا۔

زاغلول پاشا اور ان کے رفقاء کا اخراج:- اول اول تو تہدید و تخویف کو کافی سمجھا گیا۔ مگر جب یہ حیثیت بندی بغاوت کا ایک نیا سرچشمہ ثابت ہوئی۔ تو ۲۲ دسمبر ۱۹۲۱ء کو جنرل کلائیٹن نے فیلڈ مارشل جنرل ایلن بائی برطانوی سپہ سالار اعظم کا مندرجہ ذیل حکم سعد پاشا کی خدمت میں پہنچایا:

"جنگی قانون کے بموجب اس حکم کے ذریعہ سعد زاغلول پاشا کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ عام تقریروں سے پرہیز کریں۔ عام جلسوں میں شریک نہ ہوں۔ مصری وفود سے ملاقات نہ کریں۔ اخباروں میں مقالات نہ لکھیں۔ کوئی سیاسی کام نہ کریں۔ انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ فوراً قاہرہ سے چلے جائیں۔ اپنے گاؤں میں قیام کریں اور وہاں حکومت کا سرکاری افسر ان کی نگرانی کریگا۔ اسی قسم کے احکام ان کے دیگر آٹھ ساتھیوں کے نام بھی جاری کئے گئے۔

سعد زاغلول کا جواب:- لیکن سعد نے جواب دیا۔

"فیلڈ مارشل ایلن بائی کا حکم مجھے پہنچا۔ یہ حکم سخت ظالمانہ ہے۔ اس کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ میں اپنی پوری قوت سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔ قوم نے مجھے اپنا وکیل بنایا ہے۔ تاکہ میں اس کی خودمختاری کے لئے کوشش کروں۔ اس کی قوت کے سوا کسی دوسری قوت کو حق حاصل نہیں کہ وہ مجھے اس مقدس فرض سے دستبردار ہونے پر مجبور کرے۔ لہٰذا میں بدستور اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے موجود ہوں۔ ظالمانہ قوت جو کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کر گذرے۔ ہم مطمئن دل اور ٹھنڈے ضمیر کے ساتھ اس کے خاتمہ کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری کوششوں کے خلاف جتنا بھی تشدد کیا جائے گا۔ وہ ملک کو اس کی منزل مقصود سے اور بھی زیادہ قریب کرے گا۔ ملک کی منزل مقصود آزادی کامل کے سوا کچھ نہیں۔"

جب لوگوں کو خبر ہوئی کہ ان کے ہردلعزیز لیڈر کی نظربندی کا حکم ہوا ہے۔ تو وہ ہزاروں کی تعداد میں ان کے مکان کے گرد جمع ہو گئے۔ اور اس زور سے زاغلول پاشا زندہ باد اور آزادی مصر کے نعرے لگائے۔ کہ ایوانِ حکومت کانپ اٹھا۔ پولیس نے مجمع کو منتشر ہونے کا حکم دیا گولی چلی۔ اور کچھ آدمی زخمی اور دو چار ہلاک ہو کر ملک پر قربان ہو گئے۔

سعد زاغلول پاشا کی گرفتاری:- شورش کو بڑھتی ہوئی دیکھ کے خطرناک
نتائج کے پیش نظر سعد زاغلول کے مکان پر فوجی دستے متعین کر دیے گئے۔ اور آخر ۲۳ دسمبر
۱۹۲۱ء کو گرفتار کر کے سویز پہنچا دیے گئے۔ لارڈ ایلن بائی نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ مصری
بینک اور حکام ان کی اجازت کے بغیر سعد زاغلول کو کوئی روپیہ ادا نہ کریں۔ گرفتاری کس طرح عمل میں
لائی گئی۔ اور گرفتار شدگان کے ساتھ کیا شرمناک سلوک کیا گیا۔ یہ ایک اندوہناک داستان
ہے۔ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس دردناک روداد کو سعد زاغلول کی زبانی سنیں:-

جلاوطنی سے واپس ہو کر ۲۲ ستمبر ۱۹۲۳ء کی تقریر میں انہوں نے بیان کیا:-

"ٹھیک اسی تاریخ کو انگریزی فوج نے میرے مکان پر دست تعدی دراز
کیا۔ میرے گھر کو چاروں طرف سے فوج نے گھیر لیا تمام کمروں اور برآمدوں میں بندوقیں
اٹھائے ہوئے سپاہی گھس گئے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر مورچے قائم کر دیے
پھر ہتھیار بند۔ فوجی افسر میرے کمرے میں آئے میں اپنے بستر پر غافل سو رہا تھا۔
مجھے نہایت وحشت ناک طریقے سے جگایا گیا۔ اور لباس پہننے سے بھی پہلے گرفتار کر لینا
چاہا میں نے انکار کیا۔ اطمینان سے کپڑے پہنے۔ پھر مجھے نیچے اتار لائے میرے گرد
بندوقوں اور سنگینوں کا ہجوم تھا میری بیوی میرے پیچھے دوڑی ہوئی آئی مجھ سے
ملنا چاہتی تھی۔ مگر اسے روک دیا گیا۔ صلیب احمر کی ایک موٹر لائی گئی مجھے
بٹھا دیا گیا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ ایک بڑا جنگی منظر میرے سامنے تھا آگے موٹر لاریاں تھیں
مسلح موٹریں میرے پیچھے تھیں ہر طرف بندوقیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے استعمال کے لیے ادنیٰ
سی ادنیٰ بات کا انتظار کیا جاتا تھا"

ہندوستان کے لیے فکر:- سنگینوں، توپوں اور فوجی دستوں کے جھرمٹ
میں آپ کو کہاں لے جایا گیا۔ سویز میں اور ہندوستان کے تمام اشخاص کو اس
شرمناک خدمت کے لیے منتخب کیا گیا۔ سویز کی ہندوستانی چھاؤنی کے ہندوستانی سپاہی
اور ہندوستانی پہرہ داروں کے زیر حراست وہ قید رہے لیکن مرتے دم تک انہوں نے
ہندوستان کی کبھی مذمت نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ ہندوستان کی تحریک آزادی سے ہمدردی

کا اظہار کرتے رہے۔ قید و بند کا زمانہ کس طرح بسر ہوا۔ انہیں کی زبانی سنئے۔ فرمایا:۔
"مجھے سویرے لے گئے۔ مگر ایک ایسے راستے سے جو بالکل غیر آباد تھا۔ حتٰی کہ کہیں پانی تک دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ میں بہت بھوکا تھا۔ کھانے کا کوئی سامان ساتھ لینے کی اجازت نہ تھی۔ خوش قسمتی سے ایک ہندوستانی افسر کو ترس آیا۔ اس نے ایک روٹی اور پنیر کا چھوٹا سا ٹکڑا مجھے دیا۔ دن بھر کی غذا بس یہی تھی۔ شام کے ۵ بجے مجھے ہندوستانی لشکر میں پہنچایا گیا۔ فوجی افسروں کی حراست میں مجھے ایک پھٹے ہوئے خیمہ میں اتارا گیا۔ رات بھر گرم ہوائیں خیمے کے سوراخوں سے اندر آتی رہیں۔ اور ہیبت ڈالتی رہیں۔ میں اس رات مجبور ہو کر اپنے دن کے لباس ہی میں سویا۔ کیونکہ کوئی دوسرا کپڑا ساتھ نہ تھا۔ لیکن الحمد للہ مجھے کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ میں عادتاً سڑکوں پر ایک گھنٹہ گھوڑے کی سیر سے تھک جایا کرتا تھا۔ مگر اس وقت میں بالکل نہیں تھکا۔ اللہ نے میری مدد کی۔ اور ایسی قوت بخشی کہ تمام سختیاں برداشت کر گیا۔ دوسرے دن میرے ساتھی بھی پہنچ گئے۔ مجھے نہایت مسرت ہوئی کیونکہ وہ مطمئن تھے۔ اور برطانیہ کی اس ظالمانہ حرکت پر ہنستے تھے۔ ۲۹ دسمبر تک ہم ہندوستانی لشکر ہی میں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ اس دن عشاء کے وقت ہمیں حکم ملا کہ نصف گھنٹے کے اندر سفر کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں تیاری ہی کیا کرنی تھی۔ ہم ہر وقت تیار تھے۔ ہماری تیاری صرف اٹھ کھڑا ہونا تھا۔ ہم قیدیوں کی نیلی گاڑی میں سوار کیے گئے۔ ساحل پر پہنچے۔ یہاں ایک کشتی ہمارے انتظار میں تھی جس پر سوار ہوئے۔ اور جہاز میں پہنچ گئے۔ جہاز ہندوستانی سپاہیوں سے لبریز تھا۔ یہاں ہمیں معلوم ہوا کہ ہم عدن جا رہے ہیں۔ ۴ جنوری کو عدن پہنچے۔ ۲۸ فروری کو سیشلز پہنچائے گئے۔ پھر مجھے جبل الطارق بھیج دیا گیا۔ جہاں ۳ ستمبر سے ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۲۳ء تک برابر قید رہا۔ ہم نے یہ تمام مدت قید خانوں اور قلعوں میں گزاری۔ دنیا بھر سے الگ کر دیے گئے تھے۔ کسی کو بھی ہمارے پاس آنے کی اجازت نہ تھی۔ حتٰی کہ ورزش اور چہل قدمی کے لئے بھی اجازت لینا پڑتی تھی۔ ہماری تمام خط و کتابت دیکھی جاتی تھی۔ اور [illegible] منزل مقصود تک پہنچائی جاتی تھی لیکن

تمام سختیاں اور بندشیں بے بیکار تھیں کیونکہ ہمارے دلوں میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی ہم اپنی ناقابل برداشت مصیبتوں پر خوش ہوتے رہے۔ ہر مصیبت ہمیں یاد دلاتی تھی کہ ہمارا مقصد کیسا شریف اور ہماری غایت کیسی مقدس ہے۔

جیل سے بیوی کے نام خطوط:۔ زاغلول پاشا نے جیل سے اپنی رفیقہ حیات کے نام چند خطوط بھی لکھے تھے۔ فراق کی اذیتیں ان کے خیال میں ایک ایسی قربانی تھیں۔ جس کا ان کی قوم کو جائز طور پر استحقاق حاصل تھا۔ چنانچہ ایک خط میں اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"مجھے اس وطنی شعور پر فخر ہے۔ جس نے یہ مصیبت تم پر آسان کر دی۔ حالانکہ میں جانتا ہوں۔ کہ تمہارے لئے بالکل ناقابل برداشت تھی۔ میرے ابنائے وطن تمہاری اس قربانی کے ہر طرح مستحق ہیں۔ ہمارا یہ فراق کتنا ہی المناک ہو۔ لیکن ہمیں پوری ثابت قدمی اور صبر و شکر کے ساتھ اسے برداشت کرنا چاہئے۔"

زاغلول پاشا کے بعد مصر کی حالت:۔ حکومت بخیال خود سعد زاغلول پاشا کو قید کر کے مصر کی جدوجہد کا خاتمہ کر چکی تھی۔ مگر آزادی اور اس کی راہ پر چلنے والے ان حادثات سے ہمیشہ بے پرواہ ہوتے ہیں مصر گو زاغلول جیسے قائد کی رہنمائی سے محروم ہو گیا۔ لیکن وہ اپنی منزل مقصود کی طرف اسی طرح گامزن رہا۔ سعد پاشا کی بیگم صفیہ خانم نے اپنے شوہر کے ساتھ جانے سے اس لئے انکار کر دیا۔ کہ وہ اپنے خاوند کے کام کو ترقی دینا چاہتی تھیں۔ چنانچہ زاغلول پاشا کی گرفتاری کے بعد مصری قوم بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہونے لگی۔ اور اب مصر کی حقیقی قائد بیگم زاغلول پاشا بن گئیں

زاغلول پاشا کی رہائی:۔ ایک سال کے بعد حکومت نے انہیں خود بخود رہا کر دیا ان کی اعلیٰ شخصیت اور بے مثال خطابت کے باعث قیدخانہ میں بھی ان سے اچھا سلوک کیا گیا۔ حکومت کے تمام ارکان ان کی عزت کرتے تھے۔ اور جب تک سویز میں رہے۔ باقاعدہ گالف کھیلتے رہے) ۱۰ جولائی ۱۹۲۶ء کو دوبارہ اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے۔ اور جلد ہی تیسری

پیدا کر کے انہیں تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ گزشتہ ملکی تحریکات کے باعث لوگ مفلوک الحال اور صنعتیں تباہ ہو گئی تھیں۔ آپ نے مردہ صنعتوں میں دوبارہ زندگی پیدا کی۔ اور لوگوں کی غربت کے علاج کے لئے معقول تجاویز اختیار کیں۔

وفات:۔ جن دنوں سعد زاغلول اپنے دیہاتی مکان مسجد وصف میں مقیم تھے ان کے کان میں خفیف سا التہاب ظاہر ہوا۔ مرض کی نوعیت کو خطرناک دیکھ کر ڈاکٹروں نے انہیں قاہرہ تشریف لے جانے کے لئے کہا۔ قاہرہ پہنچ کر طبیعت سنبھل ہو گئی مگر کچھ دنوں بعد مرض نے از سر نو حملہ کیا۔ یہ حملہ مہلک تھا۔ ۱۰ بجے رات دائیں پہلو میں درد محسوس ہوا۔ منگل کے دن حرارت برابر بڑھتی رہی حتےٰ کہ صبح ۷ بجے اپنی بیوی سے اچانک کہا "میں ختم ہو گیا" اور اسی دن یعنی ۲۳ اگست ۱۹۲۷ء کو دن کے دس بجے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

وفات کے روز مکان کے باہر لاکھوں آدمیوں کا ہجوم تھا۔ آپ کے بھانجے فتح اللہ شاہ برکات نیچے اترے تو لوگ ان پر دریافت حال کے لئے ٹوٹ پڑے مگر فرطِ غم سے وہ ایک لفظ تک نہ کہہ سکے اتنے میں اوپر سے صدائے آہ و بکا بلند ہوئی۔ لوگوں نے دوبارہ فتح اللہ شاہ کا رخ کیا وہ اب بھی خاموش بیٹھے تھے اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر زور سے مارے۔ بس پھر کیا تھا کسی کو صبر کی طاقت نہ رہی۔ اتنے میں ڈاکٹر شفیق اوپر سے اترے اور چلّا کر کہا

"سوگوار بیوہ پر رحم کرو۔ تمہاری آہیں اسے ہلاک کر ڈالیں گی۔ وہ مر گئے لیکن اگر تم چاہو تو انہیں اپنے دلوں میں ہمیشہ زندہ رکھ سکتے ہو۔"

مجلس وزراء کا اعلان:۔ وفات کی خبر سنتے ہی مجلس وزراء کا ایک فوری اجلاس منعقد ہوا اور اس نے قوم کے نام حسب ذیل اعلان کیا:۔

"انتہائی رنج و الم کے ساتھ مصری قوم کو اس کے عظیم الشان رہنما سعد پاشا زاغلول کی وفات کی جانگداز خبر سنائی جاتی ہے۔ مختصر بیماری کے بعد موت کے بے پناہ ہاتھ نے قوم کے رہنما اس کی امیدوں کے مرکز اس کی بیداری کے قائد اس کی حمایت

کے علمبردار کو ذرا بھی مہلت دیئے بغیر چھین لیا۔ خدا مرحوم پر مسلسل رحمت نازل کرے اور قوم
کو صبر جمیل عطا فرمائے۔"

جنازہ:- رات بھر مرحوم کے مکان پر لوگوں کا ہجوم رہا۔ دوسرے دن نو بجے تمام
وزراء سفرائے دول بھی پہنچ گئے۔ دن کے بارہ بجے نعش بالائی منزل سے نیچے لائی گئی
اسپر صرف کفنی تھی۔ نعش پر نیچے پہنچتے پہنچتے پھولوں کی بارش شروع ہو گئی۔ اور دیکھتے
دیکھتے پھولوں کا ایک انبار لگ گیا۔ اس موقعہ پر محبت اور عقیدت میں ایک دلچسپ جھگڑا
ہو گیا۔ فوجی افسروں نے نعش اٹھانے سے پہلے کہا کہ جنگی روایات کی رو سے ضروری
ہے۔ کہ مرحوم کی نعش پر مصر کا فوجی پرچم ڈالا جائے لیکن بیگم زاغلول نے اعتراض
کیا اور کہا کہ زاغلول کے مقدس جسم کو قومی پرچم میں لپیٹا جائے۔ اور ان الفاظ
کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا تیار کردہ ریشمی پرچم پیش کر دیا۔ مجبوراً افسروں کو
اپنی ہٹ چھوڑنا پڑی۔ اور لاش بیگم زاغلول کے پرچم میں ملفوف کی گئی۔ اس
کے بعد ملکی افسروں کی طرف سے ایک تجویز پیش ہوئی کہ مرحوم کے تمام تمغے اس
کی نعش پر رکھے جائیں۔ کیونکہ وہ ہماری جماعت کے آدمی تھے لیکن بیگم
زاغلول نے کہا سب سے بڑا تمغہ قومی علم ہے۔ اور اس تمغہ پر کوئی تمغہ نہیں رکھا
جا سکتا۔ ٹھیک چار بجے جنازہ کو توپ پر رکھ کر قبرستان کا رخ کیا گیا۔ سب سے
آگے فوج کا جنگی باجا اس کے بعد مزدوروں اور پیشہ وروں کی جماعتوں کے
اراکین۔ اس کے بعد پھر فوجی باجا اور عام انجمنیں اور عوام تھے۔ ہلال اور صلیب
دونو کے علم ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو ہو کر اس حقیقت کا انکشاف کر رہے
تھے۔ کہ مصر میں اب ایک ہی عنصر باقی ہے "مصری قوم کی آزادی" اور یہ کہ سعد
زاغلول مسلمانوں اور عیسائیوں میں یکساں طور پر محبوب تھے۔ نماز جنازہ مسجد قیسون
میں ٹھیک چھ بجے ادا کی گئی۔ اور لاکھوں آدمی جن میں یہودی، قبطی عیسائی اور دیگر
اقوام کے افراد شامل تھے۔ انہوں نے انتہائی الحاح وزاری سے اپنے محبوب رہنما سے

لیے دعائے مغفرت کی۔
نماز جنازہ کے بعد آپ کی نعش مبارک کو امام شافعیؒ کے قبرستان میں دفن کیا گیا مٹی دینے سے پہلے فتح اللہ شاہ نے نیچے اتر کر مرحوم کو آخری سلام کیا۔ اور توپوں کے دغنے کی مہیب آوازیں سنائی دیں۔ اس پر وزیر داخلہ نے ایک رقت آمیز تقریر کی۔ پارلیمنٹ کے وزراء مرحوم کے مکان موسومہ بیت الامتہ میں بھی گئے۔ اور بیگم زاغلول کے سامنے ایک دردناک تقریر کی جس میں مرحوم کی قومی اور ملکی خدمات کا اعتراف کیا۔

سعد پاشا کی یادگاریں مجلس وزارت کی قرارداد کے مطابق سعد زاغلول پاشا کی یادگار کے طور پر قاہرہ اور اسکندریہ میں ایسے مجسمے نصب کئے گئے جن سے مرحوم کا خلیانہ جلال ٹپکتا ہے۔ ان کا مکان خرید کر قومی عمارت بنا دی گئی۔ اور اس کا نام بیت الامتہ بدستور رہنے دیا گیا۔ ان کی موروثی اور قدیمی اقامت گاہ "ابیانہ" کو سرکاری طور پر خرید کر مدرسہ قائم کیا گیا۔ اور پایہ تخت میں ایک عظیم الشان یتیم خانہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ جسے مرحوم کے جلیل القدر اور زندہ جاوید نام سے منسوب کر دیا گیا۔

بیگم زاغلول کا بیان:۔ سعد زاغلول کی وفات پر بیگم زاغلول کو اکناف و اطراف عالم سے بیشمار خطوط اور تار موصول ہوئے۔ جن کے جواب میں انہوں نے مندرجہ ذیل بیان شائع کیا۔ جسے ہم اختصاراً پیش کرتے ہیں:۔

"میرے فرزندو! اگر سعد مجھ اکیلی کا سعد ہوتا تو اس کی موت پر تمہاری تعزیتوں کا شکریہ ادا کرتی لیکن وہ تو پورے مصر کا سعد قائد اور امین تھا۔ اگر مجھے شکریہ کا حق پہنچتا ہے تو صرف اس لئے کہ اس کی محبت صرف مجھے حاصل تھی۔ اس کی رحمت تمہاری محبت اور قومی حکومت کی شفقت سب مجھے میسر آئی۔ اگر تم حق میرے لئے منظور کرو تو شکریہ قبول کرو۔ سعد مر گیا۔ اگر اس کا مطمح نظر ہنوز باقی ہے۔ آؤ اس کی جدائی کے غم کو مزید ہیبت و شجاعت کا ذریعہ بنائیں۔ کیونکہ شریف غم ایک جلیلی قوت پیدا کرتا ہے۔ جو بے روک ہوتی ہے۔ سعد مر گیا مگر عمر زندہ ہے۔ میں نہیں مگر قوم

موجود ہے۔ اُدھر سعد کا جھنڈا اٹھائیں وہی اللہ جس نے مصر کے لئے غفلت کی اندھیری کے بعد بیداری کی روشنی پیدا کردی ہمیں آئندہ بھی راہ راست دکھائیگا۔ اس قوم کیلئے سعد کا نعم البدل پیش کرے گا۔

سعد کا جانشین: سعد زاغلول پاشا کی وفات کے بعد سرکاری طور پر ان کے جانشین مصطفےٰ نحاس پاشا مقرر ہوئے الحمد للہ کہ سرزمین مصر کا یہ مدبر الوالعزم اور ذہین فرزند انتہائی بیدار مغزی اور معاملہ فہمی کیساتھ مصری قوم کی خدمات انجام دے رہا ہے زندہ باد مصر۔ پائندہ باد رہنمایانِ مصر۔

اخلاق و عادات: سعد زاغلول میں جرات، خطابت، اور دُور اندیشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ ہر کام پوری محنت، اور باقاعدگی سے سرانجام دیتے تھے لوگوں کو معمولی گفتگو میں اپنا گرویدہ بنا لینا انکا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بذلہ سنجی اور ظرافت کے باوجود ایک عجیب عظمت سایہ فگن رہتی تھی۔ اور کوئی شخص مرعوب و متاثر ہوئے بغیر واپس نہ لوٹتا تھا۔ وہ نہایت دلیر اور جری تھے۔

مطالعہ اور گفتگو: انہیں مطالعہ کا بیحد شوق تھا۔ ان کے ہاتھ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب رہتی تھی۔

قدرتِ الٰہی پر یقین: سعد کی زندگی میں ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں کہ قدرت خداوندی پر انہیں بیحد یقین اور بھروسہ تھا۔ انتہائی مصائب خطرناک ترین مواقع اور حوصلہ شکن مظالم بھی ان کے ایمان کو متزلزل کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے۔ ان کی تقریروں سے بھی ان کے اس جذبۂ ایمانی کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک تقریر میں انہوں نے کہا ہمیں بشارت ہو کہ ہم حق پر ہیں۔ حق کے متلاشی ہیں حق کی راہ پر چلتے ہیں۔ اور معلوم ہے کہ خدا حق پرستوں کا عمل رائیگاں نہیں کرتا خدا نے ہمیں یہ دیکھنے کا عادی بنا دیا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ ہماری مدد کرتا ہے مصیبتوں میں ہماری دستگیری کرتا ہے ہمیں ثابت قدم رہ کے مصائب برداشت کرتے

چاہئیں۔ خدا صابروں کے ساتھ ہے۔

معمولات:۔ سعد چھ بجے صبح بیدار ہوتے تھے غسل کے بعد ناشتہ کرتے اور مطالعہ میں منہمک ہو جاتے تھے۔ دس بجے دفتر میں آکر بیٹھتے تو ملاقاتیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ایک یا دو بجے دوپہر کھانا کھاتے تنہا کھانے کی انہیں عادت ہی نہ تھی۔ دسترخوان پر ہمیشہ دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ پھر دفتر آتے تھے۔ اور ایک گھنٹہ کام کرنے کے بعد تفریح کو نکلتے تھے۔ واپسی پر پھر مصروف مطالعہ ہو جاتے تھے۔ ۸ بجے شب کھانا کھاتے۔ کچھ دیر باتیں کرتے اور ٹھیک دس بجے کے قریب بستر پر چلے جاتے تھے۔ اور مطالعہ کرتے کرتے سو جاتے تھے۔ بالعموم چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے۔

سعد زاغلول کے اقوال

کامل آزادی: مصر کامل آزادی کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیونکہ آزادی ہر قوم کا پیدائشی حق ہے۔

ناامیدی: اسوقت ہماری حالت کیسی ہی ابتر ہو مگر ہماری قوم جیسی کوئی بڑی قوم کبھی اپنی قسمت کی طرف سے ناامید نہیں ہو سکتی۔

حاکم و محکوم کی مصلحت: حاکم قوم کی مصلحت ہمیشہ اس کی محکوم قوم کی مصلحت سے متضاد ہوا کرتی ہے۔

عہدے کی خواہش: اپنے آزاد وطن میں ایک حقیر فرد رعایا بن کر رہنا مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے۔ کہ اجنبی حکومت کے ماتحت بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کروں۔

زمانے کے انقلابات: زمانے کے انقلابات دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست بنا دیتے ہیں۔

سیاسی اتفاق: مصر اور انگلستان کے درمیان اتفاق کے معنی صرف ایک ہیں یعنی مصر کی کامل آزادی۔

انتہا پسندی: آزادی کے طلبگار انتہا پسند نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ یہ تو ایک ابتدائی چیز ہے۔ غلامی پسند کرنے والے البتہ انتہا پسند ہیں کیونکہ غلامی ذلت نفس کی انتہا ہے۔

قومی روح: قوم کی روح نہ جنگی قوانین سے مغلوب ہو سکتی ہے نہ ظلم سے نہ دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت کی قوت سے۔

اصول پروری: اگر سعد قومی اصول سے ہٹ جائے تو اُسے گرا دو۔

نکتہ چینی: میں اپنی ذات پر نکتہ چینی سنکر خوش ہوتا ہوں۔ اگرچہ وہ جھوٹی ہی ہو۔

ابنائے وطن کو نصیحت: ابنائے وطن تم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ میری نگرانی کرے صرف سعد ذمہ دار نہیں ہے۔ وطن کا ہر فرزند ذمہ دار ہے۔

قومیت: یہ دیکھکر میری مسرت بے حساب ہو جاتی ہے کہ مصر میں صرف ایک ہی فرقہ موجود ہے۔ اور وہ مصری قوم ہے۔

ہمارا مطالبہ: ہمارا مطالبہ صرف ایک لفظ ہے "آزادی"

عداوت: عداوت کمزوروں کا اخلاق ہے۔

میرا دل: میرے دل میں نہ حسد ہے۔ نہ کینہ ہے۔ میرے دل میں قومی درد کی امانت نے کسی چیز کے لئے بھی جگہ خالی نہیں چھوڑی۔

آزادی کا استحقاق: جو قوم اپنے ان فرزندوں کا خون بہتے دیکھتی ہے۔ جو آزادی چاہتے ہیں اور پھر خاموش رہتی ہے۔ وہ یقیناً آزادی کا استحقاق نہیں رکھتی۔

میری آرزو: آزادی میری آرزو ہے۔ جو ہاتھ بھی آزادی لانے میں سب سے پہلے اس کو بوسہ دوں گا۔ اگرچہ وہ میرے جانی دشمن ہی کا ہاتھ کیوں نہ ہو۔

خود اعتمادی: خود اعتمادی خود اختیاری وصف نہیں ہے بلکہ پیدائشی وصف ہے

میری دشمنی:۔ میں نے اگر کسی سے دشمنی کی ہے تو صرف اپنی قوم کی مصلحت کی وجہ سے۔

ناکامی کی علت:۔ ناکامی کی اصلی علت کارکنوں کی باہمی بے اعتمادی ہوتی ہے۔

رو رعایت:۔ قومی حقوق میں رو رعایت دخل نہیں پا سکتے۔

صبر و برداشت:۔ وہی قوم زیادہ عظمت حاصل کرتی ہے جو زیادہ مصائب برداشت کر سکتی ہے۔

برطانیہ کی ضرورت:۔ اگر برطانیہ کو مصر کی ضرورت ہے تو مصر کو اس سے کہیں زیادہ اپنی ضرورت ہے۔

قوت:۔ اگر ہم طاقتور ہوتے تو کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی کہ مصر ہمارے قبضہ میں رہنا چاہیئے۔

منفعت:۔ اگر ملکیت میں منفعت کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو دنیا تہ و بالا ہو جائے کیونکہ ہر شخص کی منفعت اسی میں ہے کہ ساری دنیا کا مالک بن جائے

عمل اور قربانی:۔ کوئی عمل حق ضائع نہیں ہوتا۔ اور کوئی قربانی رائیگاں نہیں جاتی۔

ضرورت اور قوت:۔ کسی زمانے میں بھی ضرورت قانون نہ تھی۔ کسی وقت میں بھی قوت حق کا معیار نہ تھی۔

ظلم:۔ ہر ظلم اپنے دامن میں مظلوم کے لیے خوشخبری اور ظالم کے لیے سزا چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔

محمد احمد مہدی سوڈانی

سعد زاغلول پاشا عمر کے آخری ایام میں

جمال الدین افغانی
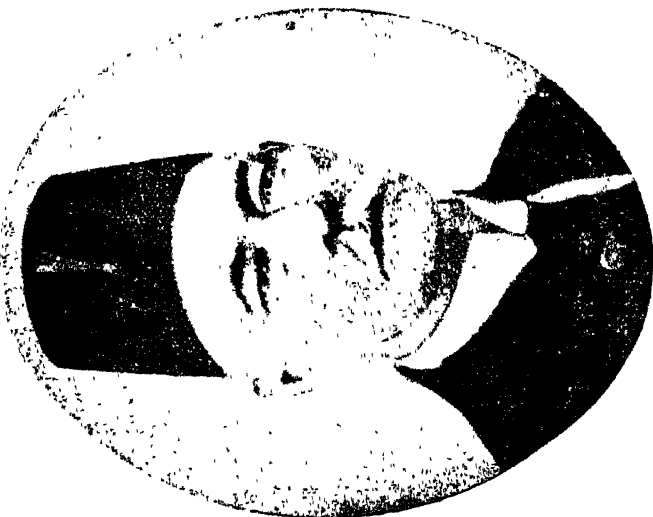
شیخ محمد احمد مہدی سوڈان

گفت اے کچیز اگر داری نظر　　　انتقام خاکِ درویشے نگر

آسماں خاکِ ترا گورے نہ داد　　　مرقدے جز در یم شورے نہ داد

انیسویں صدی ملت اسلامیہ کے عام انحطاط و زوال اور انتشار و تفریق کا سب سے زیادہ الم انگیز زمانہ ہے مغربی تسلط کے عفریت نوک پنجے درست کئے ہوئے اسلامی ممالک پر پل پڑے تھے اور حضرت صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور خبر کے مطابق اسلامی ملکوں پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کو اسی طرح پکارتے تھے جس طرح کھانے پر دوست کو دوست بلاتا ہے۔ اس وقت تمام یورپ اس بات پر متفق تھا کہ اسلامی علاقوں کو ایک ایک کر کے اپنے قبضے میں کر لیا جائے۔ انگریزی حکومت نے مصر پر تسلط جما کر سوڈان پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اور سوڈان کے سیاہ فام مسلمان باشندوں پر دوگونہ مصیبت نازل ہو چکی تھی۔ ایک طرف مصر کے خدیو کی ناقص و ناکارہ حکومت تھی۔ جو صرف ٹیکس لگانا جانتی تھی۔ لیکن باشندوں کی خدمت کے جذبے سے ناآشنا تھی۔ دوسری طرف انگریزی اقتدار تھا۔ جو برطانوی مفاد کی خاطر جونک کی طرح لوگوں کا خون پینے کے لیے تیار تھا۔ بری حکومت اور جابرانہ اقتدار یہ دو مصیبتیں خدا کا سب سے بڑا عذاب ہیں۔ جو کسی ملک پر نازل ہو سکتا ہے۔ اور بدنصیب سوڈان ان دونوں مصیبتوں میں مبتلا تھا۔

خدیو محمد علی پاشا والئی مصر نے ۱۸۲۰ء میں مصر کی طرف سے سوڈان کو فتح کرنا شروع کیا تھا۔ اور بالآخر جب اسے فتح کر لیا تو اس پر انگریزی اقتدار قائم ہو گیا ٹیکسوں نے عوام کی کمر توڑنی شروع کی۔ پہلے حکومت اپنے واجبات وصول کرتی تھی۔ پھر گورنر اور رؤسا اپنا حصہ طلب کرتے تھے۔ اور جو کچھ بچتا تھا وہ جاہل مکار اور بے درد مشائخ کی نذر ہو جاتا تھا۔ یہ اسی زمانے کا قصہ ہے کہ بردہ فروشی عام تھی۔ اور سوڈان کی بدنصیب سرزمین کے تنومند اور محنتی فرزند بھیڑ بکریوں کی طرح پکڑ کر عیسائی ممالک میں فروخت کر دیئے جاتے تھے۔

زبیر پاشا بردہ فروشی کے ذریعے معمولی آدمی سے بڑھ کر امیر اور رئیس ہو گیا تھا۔ اور یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ جنرل گارڈن کو بظاہر اصلاح حال کیلئے سوڈان بھیجا گیا تھا۔

اس مصیبت عام کے وقت سوڈان کی مظلوم زمین کے ذرے ذرے سے یہ پکار بلند ہونے لگی۔ کہ امام مہدی کہاں ہیں۔ اور وہ کب آئیں گے۔ اگر آپ نہیں آئیں گے۔ تو پھر کس لئے آئیں گے ؎

بلبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

فضائے بسیط سے کارکنان قدرت نے آواز دی۔ کہ گھبراؤ ایک مرد حق تمہاری رستگاری اور حمایت کے لئے نمودار ہوتا ہے۔ اگر تم اس کی امداد کرو گے۔ تو نجات پاؤ گے۔ اس سے غداری کرو گے تو خود بھی برباد ہو گے۔ اور اپنی آئندہ نسلوں کو بھی خراب کرو گے۔

مرد حق کی نمود

ادھر ابتلائے عام کا طوفان برپا تھا۔ اور ادھر قدرت کی آغوشِ تربیت ایک ایسے مرد مجاہد کی پرورش کر رہی تھی۔ جو سالہا سال تک دنیا کی سب سے بڑی جنگی طاقت کے دانت کھٹے کرنے والا تھا۔ اور اپنے ملک کو شہداء کے خون مجاہدوں کے نعروں اور دشمن کی تباہی سے بھر دینے والا تھا۔ اور سوڈان پر ۱۹ برس کے لئے خالص اسلامی حکومت کرنے والا تھا۔ دریائے نیل کی تیسری آبشار کے قریب ایک موضع منک ہے جس میں ایک شخص عبد اللہ نامی رہتا تھا۔ اس کی شادی ایک خاتون آمنہ سے ہوئی تھی۔ ۱۸۴۸ء میں اس گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ماں باپ نے محمد احمد رکھا۔ اور اتفاقات زمانہ نے حدیث رسولؐ کی اس اطلاع کی تکمیل کر دی۔ کہ آنے والے مہدی کا نام محمد اور اس کے ماں باپ کا نام آمنہ اور عبد اللہ ہو گا۔

محمد احمد آغاز عمر ہی سے ہونہار تھا ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی مے تافت ستارہ بلندی

ذہین۔ طباع۔ بہادر۔ جری اور خدا پرست۔ عبادت اور ریاضت کا ابتدا ہی سے شوق تھا۔ اور گو اس کے والد اور بھائی کشتیاں بنانے کا کام کرتے تھے لیکن محمد احمد کی طبیعت پڑھنے لکھنے کی طرف راغب تھی۔ وہ بھی ایک کشتی کی تعمیر کا فن سیکھ رہا تھا۔ لیکن

وہ کشتی انسانوں کو دریائے نیل کے پار اتارنے کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ وطن کو غلامی کے بحر ذخار سے نکالنے اور ساحل حریت و آزادی پر پہنچانے کے لئے تھی۔ اور جبر و استبداد کی قوتوں کو دریائے ہلاکت میں غرق کرنے والی تھی۔

محمد احمد کو اس کے چچا شریف الدین کے پاس بھیج دیا گیا۔ جہاں اس نے بارہ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔

ہجرت کی پہلی منزل

شریف الدین چاہتا تھا کہ محمد احمد بھی کشتی سازی کا فن حاصل کر لے لیکن محمد احمد کی طبیعت اس طرف رغبت نہیں رکھتی تھی۔ ایک روز چچا نے اپنے بھتیجے کو زد و کوب کیا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد احمد گھر سے نکل بھاگا اور خرطوم پہنچ گیا۔ جو مرکزی حیثیت رکھنے کے باعث سوڈان میں تحصیل علم کا مرکزی مقام تھا۔ محمد احمد آتے ہی مدرسہ خوجلی میں داخل ہو گیا۔ اور ایک مدت تک تحصیل علوم کرتا رہا۔ جب اس کی تشنگی علم یہاں بھی سیر نہ ہوئی۔ تو علاقہ بربر میں چلا گیا۔ اور ایک مدرسہ میں داخل ہو کر اس نے علوم دین کی تکمیل کر لی۔ علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد وہ علوم روحانی کی طرف متوجہ ہوا۔ اور تزکیہ نفس کی خاطر شیخ نور الدائم کا مرید ہوا۔ شیخ ایک مشہور پیر طریقت تھے۔ اور محمد احمد کے جوہر طبع کو یہاں خوب جلا نصیب ہوئی۔ وہ دوبارہ خرطوم واپس آ گیا۔ اور شیخ محمد شریف ایک دوسرے پیر کی حلقہ بیعت میں داخل ہو کر "طریقہ سمانیہ" کے مطابق جو ان اطراف میں رائج تھا۔ تزکیہ نفس کی تحصیل کرنے لگا۔

نہی عن المنکر

محمد احمد کی تعلیم کی بنیاد علم دین پر تھی۔ اور اسے علمائے اسلام کے جذبۂ حق گوئی سے پورا حصہ ملا تھا۔ سوئے اتفاق سے اس وقت کے مشائخ میں وہ تمام مفاسد اخلاق و عادات رائج تھے۔ جو عام طور پر اس حلقے میں پائے جاتے ہیں یعنی کتاب و سنت سے بُعد اور رسم و رواج اور بدعات و محدثات میں شغف۔ محمد احمد اکثر ان لغویات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا رہتا تھا اور ایک گستاخ مرید کی حیثیت سے مشہور تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ شیخ محمد شریف نے اپنے بچوں کی رسم ختنہ کے سلسلے میں ہر قسم کی خرافات کا اہتمام کیا۔ رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ ہو حق کے نعرے

لگ رہے تھے۔ اور بدعات کا طوفان برپا تھا محمد احمد سے نہ رہا گیا۔ اس نے اہل حق کیطرح پوری بے باکی کے ساتھ اس شغل کے خلاف آواز بلند کی۔ اور کہا کہ یہ اعمال شریعت اسلامی کے سخت خلاف ہیں مریدوں نے کہا لیکن ہمارے پیر تو ان کو جائز سمجھتے ہیں محمد احمد نے کہا پیر ہو یا کوئی اور جو بات ہادی عالم حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے خلاف ہے۔ اسے کوئی شخص جائز قرار نہیں دے سکتا۔

پیر کی برہمی شیخ محمد شریف اور اسکے مریدوں کا صبر و ضبط کے ...... پیمانے میں گستاخی و بے باکی کا یہ آخری جرعہ تھا جس نے ان کے تحمل کو ختم کر دیا۔ اور شیخ محمد شریف نے محمد احمد کو اپنی مریدی سے خارج کر دیا۔ محمد احمد نے بعد میں بہت معذرت کی اور کہا کہ میرا مقصد پیر کی نافرمانی نہیں تھا۔ بلکہ صرف شریعت اسلامی کے احکام کا اظہار۔ لیکن پیر صاحب معاف کرنے پر رضا مند نہ ہوئے۔ پیر طریقت کے غصے کی کمان سے تیر چل چکا تھا۔ اور اس کا واپس آنا محال۔ چنانچہ محمد احمد حلقۂ بیعت سے نکال دیئے گئے یہاں سے نکل کر وہ شیخ قریشی کے پاس پہنچے۔ اور اس کے بعد دریائے نیل کے ایک چھوٹے سے جزیرے "ابا" نام میں پہنچ گئے۔ جہاں ان کے بچپن ہی میں ان کے والدین منتقل ہو کر آ گئے تھے۔

اصلاح ملت کا آغاز اب شیخ محمد احمد کا اکثر وقت زہد و ریاضت اور تزکیہ نفوس میں گذرنے لگا۔ ان کے تقدس و تقویٰ کی شہرت دور دور پھیلنے لگی۔ اور وہ مرجع خلائق بن گئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اصلاح عوام کے لئے ایک رسالہ بھی لکھا اور وعظ و تذکیر کے لئے کردفان کا دورہ بھی کیا۔ اس دورے میں ان کو اندازہ ہوا کہ ان کے برادران وطن کس قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اور انہوں نے اپنے ذہن میں طے کر لیا۔ کہ وہ اپنی قوم کو نجات دلانے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیں گے۔

شیخ محمد احمد کے زہد و اتقا کا غلغلہ چار سو بلند ہو چکا تھا۔ ہزاروں نفوس بیعت میں داخل ہو کر مطیع و منقاد ہو چکے تھے۔ بڑے بڑے امراء اپنی لڑکیاں ان کے حبالۂ عقد میں

دینے کے لئے طیار تھے۔ لیکن محمد احمد اس مقصد کی تکمیل میں منہمک تھے جس کے لئے قدرت نے ان کو تیار کیا تھا۔ انہوں نے ایک اسلامی امارت کی داغ بیل ڈالنی شروع کردی جس کا مرکز ان کی اپنی ذات تھی۔ اور جس کی بنیاد تزکیہ نفس، اتباع شریعت اور جہاد فی سبیل اللہ پر تھی۔ جو شخص ان کا مرید ہو جاتا تھا۔ نہ صرف اس کے اخلاق و اعمال درست ہو جاتے تھے۔ بلکہ وہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے جذبے سے بھی معمور ہو جاتا تھا۔

جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت

اندر ہی اندر سوڈان کے باشندوں میں جوش جہاد کی آگ لگنے لگی۔ ۱۸۸۱ء میں محمد احمد نے سوڈان کے اکابر کے نام اس مضمون کے خطوط بھیجنے شروع کئے۔ کہ وقت اس شخص کے ظہور کا تقاضا کر رہا ہے جس کا نام مہدی قرار دیا گیا ہے۔ عالم اسلام مصائب میں مبتلا ہے۔ مصر و سوڈان پر مسیحیت کا غلبہ قائم ہو چکا ہے۔ گرجے تعمیر ہو رہے ہیں۔ لوگوں کو عیسائی بنایا جا رہا ہے اور بندگان خدا کو غیر اللہ کی پرستش کی طرف راغب کیا جا رہا ہے۔ عوام تباہ حال ہیں۔ امرا جابر ہیں۔ عیسائی غالب ہیں اور دین مغلوب۔ آؤ سب مل کر دین حق کو قائم کریں۔ مجھے خدا نے ظلم و فساد کے استیصال کے لئے مبعوث کیا ہے۔ اور اس لئے بھیجا ہے کہ لوگوں کو حقیقی اسلام کی طرف بلاؤں۔ ملک کی نجات اس میں ہے کہ ایک اسلامی امارت ہو۔ ایک بیت المال ہو اور تمام مسلمان اسلام کی پیروی کی طرف مائل ہوں۔

ملت سوڈان نے اس دعوت کا اچھا جواب دیا۔ اور لوگ جوق در جوق ان کی بیعت میں داخل ہونے لگے۔ لیکن حکومت اس محبوبیت عام اور رجوع خلق کو دیکھ کر برہم ہو گئی۔ اور جیسا کہ حکومتوں کا قاعدہ ہے۔ اس نے قوت کے زور سے اس تحریک کو مٹا دینا چاہا۔ محمد احمد نے اپنے مشن کا اعلان ماہ رمضان میں کیا تھا۔ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ مہدویت کا دعوے خود انہوں نے کیا یا حکومت نے ان سے منسوب کر دیا تاکہ ان کے خلاف عوام کو بھڑکایا جا سکے۔ لیکن یہ صحیح ہے۔ کہ حالات ضرور اتنے خراب ہو چکے تھے۔ کہ لوگ خود ہی "مہدی منتظر" کے منتظر تھے۔ اور جب محمد احمد کی دعوت نمودار ہوئی اور اس کے نتائج ظاہر ہوئے تو لوگ خود بخود پکار اٹھے۔ ع

آمد آں یارے کہ ما مے خواستیم

حق سے باطل کی پہلی ٹکر

خدیو مصر کی طرف سے سوڈان کا گورنر رؤف پاشا تھا۔ اس نے اپنے معتمد خاص ابو السعود کو حکم دیا۔ کہ وہ چار عالموں کو ساتھ لے کر شیخ محمد احمد کے پاس جائے۔ اور جزیرہ" ابا" سے انہیں خرطوم میں لائے۔ ابو السعود جزیرہ" ابا" پہنچا کشتی سے اتر کر ساحل پر گیا۔ اور پکارا کہ مہدی کہاں ہے؟ شیخ محمد احمد یہ پکار سن کر سامنے آئے اور اس کے پاس مسند پہ بیٹھ گئے۔ اور دونو میں باتیں ہونے لگیں۔

ابو السعود:۔ کیا تم ہی وہ شخص ہو جس نے مہدی ہونے کا دعوے کیا ہے۔

محمد احمد:۔ ہاں۔ میں ہی وہ مہدی ہوں جس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

ابو السعود:۔ اس دعوے سے تمہاری غرض کیا ہے۔

محمد احمد:۔ کوئی غرض نہیں۔ خدا نے مجھے اس بات پر مامور کیا ہے۔ کہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دوں کفر کو سرنگوں کر دوں اور دین حنیف کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کروں۔ خدا کی زمین پر خدا کا قانون نافذ ہو اور اسلام سربلند ہو۔

ابو السعود:۔ لیکن اس ملک پر تو پہلے ہی مسلمان حکمران ہے۔ اگر تمہیں کافروں سے جنگ کرنی ہے تو کفار کے ملک میں جاؤ۔

محمد احمد:۔ ہاں بظاہر یہ صحیح ہے لیکن باطن میں غلط ہے۔ اس ملک کا حکمران ضرور مسلمان ہے۔ لیکن اس نے ملک کا سیاہ و سپید نصاریٰ کو سپرد کر رکھا ہے۔ اور وہ جا بجا گرجے بنا کر لوگوں کو مرتد کر رہے ہیں۔

ابو السعود:۔ دیکھو شیخ تم بہت خطرناک راہ پر چل رہے ہو۔ تمہاری ٹکر حکومت برطانیہ سے ہونے والی ہے۔ جو دنیا کی سب سے زیادہ باجبروت سلطنت ہے۔ اور تم حکومت مصر کے غضاب کا نشانہ بننے والے ہو۔ میں تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ اس خیال خام سے باز آؤ میرے ساتھ چلو۔ رؤف پاشا سے ملاقات کرو۔ میں ذمہ لیتا ہوں کہ وہ تمہاری عزت کریگا اور دنیوی جاہ و جلال اور مال و منال سے تم کو

مالا مال کر دے گا۔

محمد احمد:- ابو السعود ایسا نہیں ہو سکتا میری زندگی میری نہیں۔ بلکہ میرے دین اور وطن کی ہے میں اس کی نجات و حمایت پر مامور ہوں۔ تم نصاریٰ سے مجھے ڈراتے ہو اور خدا سے نہیں ڈرتے۔ مجھے دنیا کی کسی طاقت کا خوف نہیں ہے تم سے جو ہو سکتا ہے کر گذرو۔ مجھ سے جو کام اللہ تعالیٰ لینا چاہتا ہے وہ خود لے گا۔

ابو السعود:- محمد احمد میں ایک مرتبہ پھر سمجھاتا ہوں۔ خرطوم کے گورنر سے مل لو پیشتر اس کے کہ برطانیہ کی جنگی توپیں اور جنگی جہاز گولہ باری کریں۔ اور جزیرہ ابا کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔

محمد احمد:- (قبضہ شمشیر پر ہاتھ رکھ کر) کس بدبخت کی مجال ہے۔ کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ اٹھو، یہاں سے جاؤ میں تمہارے جیسے بزدلوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا تم مجھے برطانیہ کی توپوں سے ڈراتے ہو۔ حالانکہ تمام طاقتوں کا مالک اللہ ہے۔ جاؤ میں نہیں جاؤں گا۔

مصری سپاہیوں کی ہلاکت

ابو السعود شیخ کے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اور چپکے سے اٹھ کر چل دیا۔ اور خرطوم میں جا کر اس نے گورنر سے کہا کہ یہ شخص یوں نہیں مانیگا۔ آپ مجھے پچاس مسلح آدمی دیجئے۔ تو میں اسے گرفتار کر کے لے آؤں۔ چنانچہ اسے پچاس آدمی دے دیئے گئے۔ لیکن جونہی وہ جزیرہ ابا میں پہنچے اور ابھی سوچ ہی رہے تھے۔ کہ مہدی کو کس طرح گرفتار کریں کہ محمد احمد کے آدمی ان پر ٹوٹ پڑے۔ اور ان میں سے ایک بھی نہ بچا۔ ابو السعود نے بھاگ کر جان بچائی۔ یہ ۱۸۸۱ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد ۱۸۹۹ء تک سوڈان میں "امارت اسلامی" اور برطانوی حکومت کی اس خونریز جنگ کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کے واقعات بیان کرتے ہوئے مورخ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

شیخ محمد احمد کی تحریک یکسر غیر مصافی پُرامن اور اصلاحی تھی۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ سوڈان کے مسلمانوں کی اصلاح ہو اور وہ ایک اسلامی نظام میں منسلک ہو کر دینی زندگی بسر کریں اور مسیحیت کے اقتدار اور نفوذ سے بچیں لیکن حکومت مصر نے خود ہی پہل کر کے

اس کو مصافی بنایا اور جنگی صورت دے دی۔ ابن آدم کی تاریخ جہاد کا ہمیشہ یہی عنوان رہا ہے کہ حق امن و امان کے ساتھ اشاعت کا حق مانگتا ہے اور باطل اس کو اس حق سے محروم کرنے کے لئے جنگ کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ اور حق کو مجبور کرتا ہے کہ وہ تلوار لے کر باطل کے ساتھ نبرد آزما ہو جائے۔ شیخ محمد احمد کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ حکومت مصر نے خود ہی اس شیر بیشہ معرفت کو چھیڑ دیا۔ اور ابو السعود کی مہم آغاز کار تھی۔

جنگی جہاز کی روانگی

جب ابو السعود کے ساتھیوں کا اس طرح قلع قمع ہوا تو ایوان حکومت میں غیظ و غضب کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ رؤف پاشا نے حکومت مصر کو لکھا کہ ایک بہت بڑے فتنے نے نیل کے کنارے اسی طرح سر اٹھایا ہے جس طرح فرعون کے زمانے میں موسیٰؑ نے اٹھایا تھا۔ اور مجھے اندیشہ ہے۔ کہ کہیں وہ تختہ حکومت کو الٹ ہی نہ دے۔ حکومت مصر نے تین سو فوجی جوان اور دو توپیں ایک جنگی جہاز میں سوار کرا کے بھیج دیں۔ یہ دستہ فوج ۱۱ راگست ۱۸۸۱ء کو علی آفندی کی سرکردگی میں جزیرہ ابا کے قریب پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شخص کچھ آدمیوں کے غول میں اس کی طرف آ رہا ہے۔ علی آفندی نے پکار کر کہا "تو نے کیوں خلق خدا کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے لے میں تجھے ٹھکانے لگاتا ہوں" یہ کہہ کر گولی ماری اور شخص مذکور گولی کھا کر گرا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ مقتول کے ساتھی علی آفندی پر پل پڑے اور چشم زدن میں اس کا سرتن سے جدا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے ساتھیوں کا قلع قمع کیا۔ مہدویوں کی طرف سے جو شخص قتل ہوا تھا وہ مہدی نہیں تھا۔ بلکہ شیخ محمد احمد جزیرے میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔

توپچیوں کی مرعوبیت

جب علی آفندی اور مصری سپاہیوں کا تیا پانچہ ہو رہا تھا۔ تو جہاز کے افسر نے توپچیوں سے کہا کہ توپوں کا منہ مہدی اور اس کے ساتھیوں پر کھول دو لیکن ان پر کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ گولہ باری سے انکار کرنے لگے۔ بالآخر جب سختی کی گئی تو انہوں نے فائر کئے لیکن سب ہوائی تھے۔ اس اثنا میں شیخ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے مجاہدوں سمیت کسی دوسری جگہ چلے

گئے اور یہ مہم بھی ناکام و نامراد ہو کر واپس لوٹ گئی۔ ابوالسعود ہزیمت خوردہ اور مایوس ہو کر خرطوم چلا گیا۔

سعید پاشا کی یورش

شیخ نے سوچا کہ جزیرہ ابا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے احمد مکاشف کو اپنا نائب مقرر کر کے خود کوہ کردفان میں پناہ لی۔ یہاں ان کے ساتھی زہد و ریاضت کی زندگی گذارتے تھے اور درویش کہلاتے تھے۔ جب حکومت مصر کو درویشوں کی نقل مکانی کا علم ہوا۔ تو اس نے محمد سعید پاشا کو جو ۱۴ سو سپاہیوں کے ساتھ نیل ابیض کے قریب مقام کاوا میں مقیم تھا حکم دیا کہ محمد احمد کی سرکوبی کرے۔ محمد سعید پاشا لشکر کو لے کر کردفان پر حملہ آور ہوا۔ شیخ کردوفان کے جنوبی درّوں میں چلے گئے۔ مصری لشکر ان کے تعاقب میں چلا لیکن ایک مہینے تک جنگلوں اور پہاڑوں میں سر مارتا رہا۔ بھوک پیاس اور تکان سے سب کا سب ہلاک ہو گیا۔ اور شیخ کا سراغ نہ پا سکا۔

زبردست مہم

اس کے بعد دو اور مہمیں روانہ ہوئیں۔ اور ان کا بھی وہی انجام ہوا جو محمد سعید پاشا کی فوج کا ہوا تھا۔ پوری کی پوری فوجیں نیست و نابود ہو گئیں۔ رشید بے حاکم فشید زبردست جمعیت کے ساتھ نکلا۔ اور ۸ر دسمبر ۱۸۸۱ء کو اس نے مہدوی فوجوں کو آلیا۔ دونوں کا مقابلہ ہوا۔ خدا کی قدرت سامان جنگ سے مسلح مصری فوج کو درویشوں نے محض اپنے نیزوں سے ہلاک کر دیا۔ شیخ کو کافی سامان حرب دستیاب ہوا اور ان کے مجاہد بھی آلات جنگ سے مسلح ہو گئے ۱۸۸۲ء میں رؤف پاشا پر عتاب حکومت نازل ہوا اور وہ معزول ہو کر خرطوم سے چلا گیا۔

درویشوں کے سروں پر انعام

رؤف پاشا کی ناکامیوں کا انتقام لینے کے لئے حکومت مصر نے عبدالقادر پاشا کو سوڈان کا گورنر جنرل مقرر کیا لیکن اسی اثنا میں مہدویوں نے سرزمین سنار پر مسلسل حملے کئے اور پورے علاقے پر قابض ہو گئے۔ عبدالقادر پاشا نے شلالی پاشا ایک فوجی جرنیل کو چھ ہزار فوج دے کر شیخ محمد احمد کے خلاف روانہ کیا۔ مئی ۱۸۸۲ء میں یہ فوج فشودہ میں داخل ہو کر رجون

کو مہدویوں کے قریب پہنچی۔ لیکن یکایک مہدویوں نے اس پر ایسی یورش کی کہ تمام فوج
کو کاٹ کر ڈال دیا۔ اور بے شمار مال غنیمت حاصل کیا۔ عبدالقادر پاشا نے اب مہدویوں
کے خلاف پوری تیاریاں شروع کیں۔ اس نے اعلان کیا کہ جو شخص درویشوں کو قتل کرے گا۔
اس کو فی درویش دو پونڈ انعام دیا جائیگا اور فی افسر اٹھارہ پونڈ۔ گویا درویش جنگلی جانور تھے
جن کی ہلاکت کے لئے ایک مہذب حکومت انعام مقرر کر رہی تھی۔ لیکن اس اعلان کا کچھ نتیجہ
نہ نکلا۔ درویشوں کی ہر دلعزیزی اتنی زیادہ تھی کہ کسی شخص کو انہیں قتل کرنے کی جرأت
نہ ہوئی۔ عبدالقادر پاشا نے اشتہار چھپوا کر بھی مہدویوں میں پھینکے کہ جو لوگ محمد احمد کو
چھوڑ کر حکومت کی اطاعت قبول کرلیں گے۔ ان کو مالا مال کر دیا جائیگا۔ لیکن کوئی درویش
اس لالچ میں نہ آیا۔

۱۲ ہزار فوج کا حملہ

اب عبدالقادر پاشا نے ۱۲ ہزار فوج جمع کی۔ ایک ہزار کو کردوفان
کے صدر مقام ابیض کی حفاظت پر مامور کیا۔ اور بقیہ کو حملے کا حکم
دیا۔ اتنے میں مہدی نے ابیض پر حملہ کر دیا۔ محمد سعید پاشا نے کہ اس مقام کا حکمران تھا تمام
اطراف سے فوجیں جمع کیں۔ اور شہر پناہ کے دروازے بند کر کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔
ستمبر ۱۸۸۲ء میں مہدی شہر کے سامنے پہنچے اور سعید پاشا کو لکھا کہ شہر ہمارے حوالے کر دو
اس نے قاصد کو واپس لوٹا دیا۔ اور دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ شہر کی حفاظت کرنے
لگا۔ شہر کے بہت سے لوگ نکل نکل کر شیخ کے پاس پہنچنے لگے۔ کردوفان کا مشہور تاجر
الیاس پاشا جو کسی زمانے میں ابیض کا حاکم بھی رہ چکا تھا۔ ان میں شامل تھا۔ شیخ کے پاس
صرف چھ ہزار مجاہد تھے۔ اور ان کے پاس مصری مال غنیمت کی عمدہ بندوقیں تھیں۔ ان
کے علاوہ دوسرے درویش تھے۔ جو بالعموم نیزوں اور تلواروں سے لڑتے تھے۔ چونکہ شہر پناہ
بہت مضبوط تھی۔ اور اس کی تسخیر دشوار۔ اس لئے شیخ کو اس مہم میں سخت ناکامی ہوئی۔
ان کا اپنا بھائی محمد اور عبداللہ التعائشی خلیفہ مہدی کا بھائی یوسف میدان میں کھیت رہے۔
اور ہزاروں آدمی شہید ہو گئے۔ اب انہوں نے حملہ کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ بلکہ محصورین کو
مجبور کر کے اطاعت پر آمادہ کرنے کے لئے محاصرہ شروع کر دیا۔ یہ تدبیر کامیاب ہوئی اور

ساڑھے چار ماہ کے بعد شہر مسخر ہو گیا۔ تمام کردوفان شیخ کے قبضے میں آگیا۔ بے شمار سامان جنگ غلہ اور رسد حاصل ہوا سعید پاشا بھی گرفتار ہو گیا۔

شرعی حکومت کا قیام

شیخ نے علاقہ کردوفان پر قابض ہونے کے بعد اس میں شرعی اور دینی نظام حکومت رائج کر دیا۔ اور دنیا نے صدیوں کے بعد اس علاقے میں اسلامی حکومت کا صحیح خاکہ مشاہدہ کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد پورا ہوا کہ الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰة واتوا الزکوٰة وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر مومن وہ ہیں کہ اگر وہ حاکم بنائے جائیں تو نماز قائم کریں۔ زکوٰة ادا کریں اور نیکی کا حکم دیں۔ اور بدی سے روکیں۔

کردوفان سے فارغ ہونے کے بعد شیخ نے اپنے مبلغ اور دعاة سوڈان کے دوسرے علاقوں میں بھی بھیجنے شروع کئے عثمان دغنہ جو معتمد خاص تھا۔ اس نے مشرقی سوڈان میں مہدوی دعوت پھیلائی۔ لوگ جوق در جوق مہدوی علم کے نیچے جمع ہونے لگے۔ اس وقت مصر اور انگلستان کی حکومتوں نے پھر فیصلہ کیا کہ اس فتنے کا سر کچل دینا چاہیئے۔ چنانچہ جنرل ہکس کے ماتحت جو ایک آزمودہ کار سپہ سالار تھا۔ ایک زبردست فوج مہدویہ کی سرکوبی کے لیئے روانہ کی گئی۔

مصری اور انگریزی فوجوں کی تباہی

جرنیل ہکس نے یہ مہم انتہائی عقلمندی اور تدبر سے مرتب کی۔ اس کے ساتھ ۹ تجربہ کار یورپی افسر تھے۔ فوج کی تعداد ساڑھے گیارہ ہزار تھی۔ اس میں سات ہزار مصری پیدل فوج تھی۔ ساڑھے پانچ ہزار اونٹ تھے۔ پانسو گھوڑے چار توپیں جرمن کارخانہ کرپ کی دس پہاڑی اور دس میدانی توپیں تھیں اور انگلستان کے اکثر بڑے بڑے اخباروں کے نامہ نگار ہمراہ تھے۔ فوج کے حالات سے معلوم ہوگا کہ صحرا۔ میدان۔ پہاڑ سوار پیدل ہر طرح لڑنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ فوج جوں جوں بڑھتی جاتی تھی۔ راستے میں چوکیاں قائم کی جاتی تھی۔ تاکہ خطوط واپسی محفوظ رہیں۔

ابیض سے ۳۰ میل کے فاصلے پر درویشوں سے مقابلہ ہوا۔ درویش انگریزی اور مصری

فوج پر اس طرح گرے جس طرح عقاب چڑیوں پر اور شیر ہرنوں کے ریوڑ پر گرتے ہیں۔ سرکاری فوج بدحواس ہو گئی اور ایک دوسرے کو خود ہی کاٹنے لگی۔ قواعد پریڈ توپ اور پیدل سوار کسی کام نہ آئے اور تھوڑی ہی دیر میں اس کا صفایا ہو گیا۔ ایک شخص نہ بچا۔ یہاں تک کہ نامہ نگار بھی مارے گئے۔ کہتے ہیں صرف تین سو آدمی بچے تھے۔ اور وہ بھی ایسے جن کا تعلق فوج سے نہیں تھا۔ بلکہ غیر معاشی تھے۔ ان میں جرنیل ہکس کا خانساماں محمد نور بارودی بھی تھا۔ جس نے داستان مصیبت بیرونی دنیا کو سنائی۔ اس لڑائی کے بعد سوڈان کے قبائل نے شیخ کی اطاعت قبول کر لی۔ خود مصری فوج کے سپاہی بھی اس مردِ خدا کی صداقت کے قائل ہو کر اور بھاگ بھاگ کر مہدویوں میں شامل ہونے لگے۔ افریقہ کے مسلمانوں میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ شیخ فی الواقعہ مہدی ہیں۔ اور ان کے لوائے سعادت کے نیچے جنگ کرنا بدر و اُحد کے مجاہدین و شہدا کا مرتبہ حاصل کرنا ہے۔

عثمان دغنہ کے معرکے ادھر کردوفان میں آوازۂ حق اس طرح بلند ہو رہا تھا۔ دوسری طرف سواکن کے علاقے میں عثمان دغنہ نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ مصری فوجوں کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں۔ ایک مقام پر پانسو مصری فوج کو عثمان دغنہ نے صرف ڈیڑھ سو آدمیوں سے کاٹ کر ڈال دیا۔ بالآخر جنرل ولنٹائن بیکر کی سرکردگی میں ایک زبردست مہم روانہ کی گئی۔ لیکن عثمان دغنہ نے صرف ۱۲ سو آدمیوں سے اس کا ستیاناس کر دیا۔ چار کروپ توپیں پانچ لاکھ کارتوس اور تین ہزار بندوقیں مہدویوں کو دے کر جنرل بیکر مایوس و نامراد تھوڑی سی فوج کے ساتھ سواکن . . . پہنچ گیا۔

شیخ کی مملکت کے حدود اب اتنے وسیع ہو گئے تھے۔ اور ان کی ہیبت اتنی غالب آگئی تھی کہ علاقہ انفشیر کے انگریز گورنر سر سلاٹن نے اظہار عقیدت کر کے اپنا علاقہ شیخ کے حوالے کر دیا۔ مصری اسے سلاطین پاشا کہتے تھے۔ شیخ نے اس کا نام عبدالقادر رکھا۔ اور اسے اپنے پاس العبید میں بلا لیا۔

جنرل گارڈن کی آمد اب انگلستان نے جنرل گارڈن کو خرطوم بھیجنے کی تجویز

کی۔ یہ شخص سوڈان میں گورنر رہ چکا تھا اور اس ملک کے حالات سے واقف تھا اور توقع کی جاتی تھی کہ وہ مہدویہ کا استیصال کر سکے گا۔ گارڈن لندن سے ۲۰ر جنوری ۱۸۸۴ء کو روانہ ہوا۔ بربر پہنچا اور وہاں سے اس نے سوڈان کے نام منشور حریت جاری کیا جس میں نصف محصولات معاف کر دیئے۔ لونڈی، غلام رکھنے اور ان کی خرید و فروخت کی اجازت دی اور تمام لوگوں کی جرم بخشی کی۔ اس نے شیخ کو بھی خط لکھا جس میں ان کو دارفور کا سلطان تقرر کیا۔ اور تحفے تحائف بھیجے لیکن شیخ نے تحفے واپس کر دیئے اور لکھا کہ ہیں کفار کی بخشش و عطا کا روادار نہیں۔ تمہارے لئے بہتر ہے کہ اطاعت اختیار کرو اور اسلام قبول کرو تاکہ نجات حاصل کر سکو۔

خرطوم کا محاصرہ

جب جنرل گارڈن خرطوم پہنچا تو انگریزی فوجوں میں مسرت و خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے کئی ماہ کا سامان رسد جمع کر کے محصور ہونے کا انتظام کر لیا۔ چاروں طرف مہدویہ کا زور تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ خرطوم کا عنقریب محاصرہ کیا جائیگا یہ قیاس صحیح ثابت ہوا۔ شیخ نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ قاہرہ کا وہ برقی سلسلہ جو خرطوم سے وابستہ تھا اس کو درویشوں نے کاٹ ڈالا اور گارڈن اور اس کی انگریزی فوج سب طرف سے منقطع ہو کر محصور ہو گئی۔ گارڈن نے کئی مرتبہ حکومت مصر و انگلستان کو حالات سے اطلاع دینے کی کوشش کی لیکن اس کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ اس نے کرنل اسٹورٹ کو ایک جہاز میں خط دے کر روانہ کیا لیکن تقدیر الٰہی نے اسے ایک چٹان سے ٹکرا دیا اور جہاز غرق ہو گیا۔ اسٹورٹ کشتیوں میں سوار ہو کر ہمراہیوں سمیت ایک گاؤں میں پہنچا۔ لیکن دیہاتیوں نے انہیں "بے دین فرنگی" کہہ کر قتل کر ڈالا۔

جب گارڈن کی کوئی اطلاع لندن نہ پہنچی اور اسٹورٹ کی موت کا حال معلوم ہوا تو انگلستان میں سخت تشویش و اضطراب پھیل گیا۔ اس وقت گلیڈ اسٹون وزیر اعظم تھا۔ اس نے لارڈ ولزلی کی سرکردگی میں ایک امدادی مہم روانہ کی اور حکم دیا کہ کسی طرح گارڈن اور اس کی فوج کو خرطوم سے نکال لاؤ۔ حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ سوڈان کو خالی کر کے اسے شیخ ہی کے حوالے کر دیا جائے۔

ولزلی ۹ ستمبر ۱۸۸۴ء کو اسکندریہ پہنچا اور وہاں سے قاہرہ آیا۔ اس کے سامنے خرطوم پہنچنے کی کئی تجویزیں رکھی گئیں اول یہ کہ بحیرہ قلزم سے ہو کر بندرگاہ ٹرنکنیٹسٹ پر اترے اور سواکن ہوتا ہوا ابر بر اور وہاں سے خرطوم جائے۔ یہ فاصلہ ۸۰۰ میل کا تھا۔ دوسرے یہ کہ قاہرہ سے براہ نیل خرطوم جائے۔ یہ مسافت ۱۶۵۰ میل تھی۔

ولزلی نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ ۳ نومبر کو ولزلی ڈنگولہ پہنچا۔ محمد یاور حاکم ڈنگولہ کی سرکاری خدمات کے صلے میں کے۔سی۔ ایم۔ جی کا خطاب عطا کیا۔ اس کے بعد وہ آگے روانہ ہوا اور کورٹی میں اپنی فوج کے دو حصے کر دیئے۔ ایک کو خشکی کے راستے روانہ کیا دوسرے کو دریائے نیل کی راہ سے لے کر خود روانہ ہوا۔ اس اثناء میں اس کے پاس گارڈن کے پیغام پہنچنے لگے جن میں سے تحریری طور پر تو یہ لکھا گیا تھا کہ خرطوم میں سب طرح خیریت ہے لیکن زبانی قاصدوں کے ذریعہ یہ بتایا گیا تھا کہ پیمانہ صبر لبریز ہو رہا ہے ہفتہ عشرہ میں خاتمہ ہو جائیگا۔

جو فوج خشکی کی راہ سے میجر جنرل سر ہربرٹ اسٹوارٹ کی کمان میں جا رہی تھی۔ مہدوی فوجوں سے ۱۷ جنوری ۱۸۸۵ء کو اس کا مقابلہ ہوا۔ اس معرکے میں سر اسٹوارٹ زخمی ہو کر گرا اور ہلاک ہو گیا۔ مارننگ پوسٹ اور سٹینڈرڈ کے نامہ نگار مارے گئے۔ ادھر یہ لوگ خرطوم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دوسری طرف خرطوم میں گارڈن اور اس کے ساتھیوں پر عرصہ حیات تنگ ہو رہا تھا۔ جب حالت نہایت نازک ہو گئی تو اہل شہر نے شیخ کو اطلاع دی کہ اب انگریزی فوج میں دم نہیں رہا بلا توقف حملہ کر دیجئے شہر میں انگریزی فوج کی حالت نہایت خراب تھی۔ لوگ علانیہ انگریزوں کو گالیاں دیتے تھے۔ گارڈن سب کچھ سنتا تھا اور دم نہیں مارتا تھا۔ بالآخر مہدوی فوجوں نے محاصرہ سخت کر دیا۔ اور توپوں کے دہانے فصیل شہر پر کھول دیئے۔ خرطوم جنگی اعتبار سے نہایت مضبوط شہر ہے۔ اس کے شمال اور مغرب میں دریائے نیل بہتا ہے۔ اور مشرق اور جنوب کی طرف نہایت مضبوط شہر پناہ ہے اور شہر پناہ کے باہر نہایت گہری خندق۔ مہدوی گولہ باری سے شہر میں آگ لگ گئی۔ گارڈن کو توقع تھی کہ کمک آنے والی ہے لیکن اس کی توقع پوری نہ ہوئی۔ خرطوم کے عیسائی سوداگر مارونی کا بیان ہے۔ کہ ایک رات میں گارڈن کے پاس گیا میں نے دیکھا

کہ وہ دیوان خانے میں بیٹھا ہے۔ مجھ کو دیکھتے ہی کہنے لگا "میرا خیال تھا کہ کمک آنے والی ہے لیکن اب میں مایوس ہو گیا ہوں۔ لوگ میرا اعتبار نہیں کرتے۔ تم جاؤ اور جس قدر آدمی آدمی مہیا ہو سکیں لے کر مقابلہ کرو اور مجھے چرٹ پینے دو۔" گارڈن سخت بدحواس تھا تفکرات سے اس کے بال سفید ہو گئے تھے۔ آخر کار اس نے اپنی شکستہ دل فوج کے ساتھ آخری مقابلہ کیا۔ شکست کھائی۔ مہدوی فوج اللہ اکبر کے نعرے لگاتی ہوئی ۲۶ جنوری ۱۸۸۵ء کی شب کو خرطوم میں داخل ہو گئی۔ صبح کو جنرل گارڈن کی حیرت زدہ پھٹی ہوئی آنکھوں نے دیکھا کہ مہدوی علم گورنمنٹ ہاؤس پر لہرا رہا ہے۔ ہزاروں آدمی کوٹھی کے آس پاس جمع ہیں لیکن اندر داخل نہیں ہوتے مبادا اس میں بارود کی سرنگیں ہوں۔ بالآخر ۴ قوی ہیکل آدمی اور ان کے کچھ ہمراہی اندر داخل ہو گئے پہرہ داروں کو قتل کر دیا۔ چاروں مجاہد گارڈن کی طرف بڑھے اسے دیکھ کر انہوں نے کہا "ملعون آج تیرا دن آ گیا" یہ کہہ کر نیزہ مارا۔ گارڈن نے دائیں ہاتھ پر روکا اور پیٹھ پھیر لی۔ ایک شخص نے دوسرا وار کیا جس سے مہلک زخم آیا۔ گارڈن زمین پر گر پڑا اور مہدویوں نے اس کا سر قلم کر لیا۔

اسی روز صبح کو چارلس ولسن کے جہاز خرطوم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ خرطوم پر مہدوی جھنڈے لہرا رہے ہیں اور معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ انگلستان میں یہ خبر پہنچی تو ہر طرف اداسی چھا گئی۔ سر چارلس ولسن سے تاخیر کے لئے جواب طلب کیا گیا۔ اس نے جواب دیا کہ انگریزی فوج اتنی کمزور تھی۔ کہ اطمینان کئے بغیر کہ اس میں مقابلے کی طاقت ہے آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ نیز فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ۲۶ جنوری کی صبح سے پہلے ہم کسی حال میں خرطوم نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اور اس وقت تک کام تمام ہو چکا تھا۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ تو محض اسباب ظاہری کی تعبیرات ہیں تقدیر الٰہی معاملات کے تصرف اور ترتیب میں مصروف تھی۔ اس کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ کہ مہدوی یورشوں کے سامنے دنیا کی سب سے بڑی طاقت بھی عاجز و درماندہ رہے گی۔ مقدرات ہر قدم پر ٹھوکریں پیدا کر رہے تھے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی جماعت کا ساتھی ہو جاتا ہے۔ تو پھر اس کے دشمنوں کی کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جب خرطوم کی تسخیر کی اطلاع ولزلی کو پہنچی تو اس نے انگریزی فوجوں کی واپسی کا حکم دیا اور انگلستان سے خط وکتابت کرنے لگا وہاں سے حکم آیا۔ کہ مہدی کی روک تھام کے لئے بربر پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ اس غرض کے لئے تیرہ ہزار فوج طیار کی گئی۔ جس میں غلام اور غلام ساز ہندوستان کی بھی چار پلٹنیں تھیں اور جنرل ہڈسن اس کے کمانڈر تھے۔ جنرل گریم انگریزی فوج کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس میں پانسو افسر سوا دس ہزار سپاہی پونے سات ہزار گھوڑے پونے تین ہزار اونٹ آٹھ سو خچر اور پونے تین ہزار خدمتگار تھے۔ اس فوج کے سامنے عثمان دغنہ کا خاتمہ کر کے جنگل کو ریل کے لئے صاف کرنے کا اہم کام تھا ۲۰ مارچ ۱۸۸۵ء کو یہ فوج ہاشین روانہ ہوئی جو سواکن کے قریب ہے۔ یہاں مہدوی لشکر سے مقابلہ ہوا۔ درویش "منگال لانسرز" کی رسالہ فوج پر شیروں کی طرح جھپٹے اور گو پیدل تھے مگر تھوڑی ہی دیر میں اس کا صفایا کر دیا۔ اس کے بعد سواکن اور تماعی کے مابین مورچہ بنایا گیا۔ لیکن ابھی وہ مکمل بھی نہ ہوا تھا۔ کہ مہدوی فوجیں سر پر پہنچ گئیں۔ اور انگریزی فوجیں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئیں۔

۳ اپریل کو جنرل گریہم آٹھ ہزار بہترین انگریزی فوج لے کر بڑھا۔ مگر عثمان دغنہ کا طرف کمپ چلا سکا۔ اس کے ساتھ ہی سر جان میک نیل کو بھی سخت ہزیمت ہوئی اور انگریزوں کو مجبور ہو کر یہ تسلیم کرنا پڑا۔ کہ شیخ سے جنگ کرنا خدا سے لڑنا ہے۔ عثمان دغنہ خدا کا عذاب تھا۔ جو انگریزی فوجوں پر نازل ہوا تھا۔ جتنی ریلوے لائن دن میں تیار ہوتی۔ اس کو وہ رات میں اکھاڑ دیتا۔ بالآخر ولزلی نے سواکن پہنچ کر مہم کی کمان کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کی قسمت اچھی تھی۔ اتنے میں انگلستان سے حکم آ گیا۔ کہ ریلوے لائن بنانا بند کر دو اور سامان انگلستان روانہ کر دو۔ اب شیخ پورے سوڈان کے حاکم تھے اور برطانوی حکومت عجز و نامرادی کے ساتھ ان کے مقابلے سے دستبردار ہو چکی تھی۔

۱۸۸۵ء میں شیخ محمد احمد نے اپنے وطن کو آزاد کرایا۔ وہ اس سے پہلے ہی اپنی امارت اسلامی میں شرعی حکومت قائم کر چکے۔ اب پورا سوڈان دینی حکومت کی برکات سے بہرہ اندوز ہو گیا۔ اب اللہ تعالیٰ کو ان سے جو کام لینا تھا وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔

لہذا ۲۱ر جون ۱۸۸۵ء کو پیغام اجل آ گیا۔ اس وقت شیخ کی کل عمر ۳۷ برس کی تھی انہوں نے تمام اعیان حکومت کو جمع کیا اور کہا میرا وقت آ پہنچا ہے۔ اب میں اللہ کے حضور جا رہا ہوں اپنے بعد عبداللہ کو اپنا جانشین بناتا ہوں۔ میری طرح اس کی اطاعت کرنا۔ اس کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف ہو گئے اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ہ

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن　　　خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

شیخ کے ایک عزیز احمد بن سلیمان نے اسی پلنگ کے نیچے جہاں ان کا انتقال ہوا تھا۔ ان کی قبر کھدوائی اور اس طرح انہیں مرنے کے بعد بھی سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان کے خلیفہ عبداللہ نے ایک عالی شان گنبد مقبرہ تیار کرایا۔ اس کا سنگ بنیاد خود رکھا اور اس کے لئے اپنے کندھوں پر اٹھا کر پتھر لایا۔ اور اس کی تقلید میں دوسرے لوگ بھی لائے۔

خلیفہ مہدی عبداللہ نے دو مرتبہ مصر پر حملہ کیا اور ۱۸۹۹ء تک انگریزی فوجوں سے مہدویہ کی لڑائیاں ہوتی رہیں لیکن ان مسلسل جنگوں نے درویشوں کی قوت کمزور کر دی۔ یہاں تک کہ لارڈ کچنر نے سوڈان کو دوبارہ فتح کیا۔ اور مہدوی تحریک اور اس کے آثار کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لارڈ کچنر اور اس کی انگریزی فوج نے اس موقعے پر جس شقاوت قلب اور عدم شرافت کا ثبوت دیا۔ اس کی مثال تیمور و چنگیز کی وحشت و بربریت میں بھی نہیں ملے گی۔ شیخ محمد احمد اور ان کے درویشوں نے بلاشبہ انگریزی فوجوں کے دانت کھٹے کئے تھے لیکن انہوں نے ان کے مُردوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی تھی۔ بلکہ اکثر معرکوں میں غیر مصافی افراد کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا لیکن لارڈ کچنر نے ام درمان کی تسخیر کے بعد مہدی کی قبر اور ان کی لاش سے اور ان کے مجروح اور معذور پیرووں سے بھی ایسا وحشیانہ انتقام لیا۔ کہ قیامت تک مورخ لارڈ کچنر اور اس کے شقی القلب اور کینہ ساتھیوں پر لعنت بھیجتا رہیگا۔ اس نے شیخ مرحوم کے مقبرے کو توپ سے اڑا دیا قبر کو کھود کر اس میں سے شیخ کی لاش نکالی۔ اس کا سر جسم سے الگ کیا۔ لاش کے ٹکڑے

کر کے انہیں نیل میں پھینک دیا۔ اور سر جنرل گارڈن کے بھتیجے کو جو یا جو انگریزی فوج میں افسر تھا۔

مورخ حیران ہے کہ اس طریق سے اس ذلت و نامرادی کا بدلہ کیونکر لیا جا سکتا ہے جو شیخ کے ہاتھوں جنرل گارڈن اس کی انگریزی فوج۔ انگریزی حکومت اور انگریز قوم کو برداشت کرنی پڑی تھی۔ مرنے کے بعد لاش سے کوئی سلوک ہو۔ اس سے زیادہ سے زیادہ انگریزی تہذیب و شرافت کے ناصیۂ شہرت پر رسوائی کا داغ ثبت ہو سکتا ہے۔ شیخ کی کامیابیوں اور فتح مندیوں کا انتقام تو نہیں لیا جا سکتا۔ لارڈ کچنر نے اپنے زعم میں شیخ سے انتقام لے لیا لیکن بہت جلد یعنی پندرہ سولہ برس کے بعد ہی کچنر جس نے شیخ کی لاش کی بے حرمتی کی تھی۔ خود اس بری طرح کھارے میں غرق ہو کر ختم ہوا۔ کہ اس کی لاش کا نام و نشان بھی نہ ملا۔ شیخ کی یہ بھی ایک کرامت ہے۔ کہ جنگ عظیم میں جرمن آبدوز کشتی نے لارڈ کچنر کے جنگی جہاز کو بحیرہ شمالی میں بم سے اڑا کر سمندر کی تہ میں بھیج دیا اور مچھلیوں نے اس کے جسم کو نوچ نوچ کر کھایا ان فی ذالک لعبرۃ لاولی الالباب۔

جب کچنر اپنی "قومی شرافت" کا اظہار کر چکا۔ تو اس کی قوم نے اس کی وحشت و جہالت پر مگرمچھ کے آنسو بہائے۔ اخبارات میں اس کو سرزنش کی گئی اور اس کے فعل کو برطانوی شرافت کے لئے تباہ کن بتایا۔ کچنر نے عذر گناہ کے طور پر معذرت پیش کی جن میں سے ایک عذر یہ تھا کہ مجھ سے خود مصری فوجوں کے مسلمان افسروں نے کہا تھا۔ کہ مہدی کی لاش کو نکال کر مٹھ کلانے لگا دینا چاہئیے ورنہ مسلمان جہلا سمجھیں گے کہ مہدی کے تقدس نے ہمیں ایسا کرنے سے مجبور کر دیا۔ اللہ اکبر مسلمانوں کی بدبختی ہمیشہ مسلمانوں کے ہی ہاتھوں ہوئی ہے اور مسلمان غداروں ہی نے کفار کو مسلمانوں کے ساتھ بدتمیزی کا سلوک کرنے کے مشورے دیئے ہیں۔ ہندوستان میں تو ہر روز اس قسم کے مناظر دکھائی دیتے رہتے ہیں۔

کچنر نے فوت شدہ مہدی کے ساتھ ہی کمینہ پن کا سلوک نہیں کیا۔ بلکہ ان کے زندہ مگر مجروح پیروؤں کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ کیا جو مہذب اقوام کے لئے انتہائی ذلت

کا موجب ہو سکتا ہے۔ اس نے ام درمان کے بے گناہ اور بے قصور باشندوں سے قرآن مجید چھین لیا کہ یہی کتاب مقدس ان تمام تعلیمات کا خزانہ ہے۔ جو مسلمانوں کو نصاریٰ کی اطاعت سے انکار کراتی ہیں اور اسی کے ارشادات سے مستفید ہو کر مسلمان جہاد و شہادت کے ولولوں سے معمور ہوتے ہیں تین روز تک ام درمان میں قتل عام اور لوٹ مار کی اجازت دی گئی۔ مہدی کا خزانہ جس میں بیس لاکھ روپیہ جمع تھا لوٹ لیا گیا ہزاروں زخمیوں کو یا تو تڑپتا ہوا چھوڑ دیا گیا یا نیزوں سے مار مار کر شہید کر دیا گیا لینیسٹر رجمنٹ کی ایک کمپنی کو حکم دیا گیا تھا کہ تمہیں جو زخمی ملے۔ اس کو برچھوں سے مار کر ختم کر دو۔

آج جبکہ مہدی کی تاریخ مرتب کرنے والے قلم بالعموم مسیحیوں کے ہیں جن کو شیخ کی تحریک سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ مہدوی تحریک کے متعلق غلط فہمیوں کو الگ کرنا مشکل ہے۔ دشمنوں نے حقیقت حال کو چھپانے کے لئے اتنے پردے کذب و دروغ ڈال دیئے ہیں۔ کہ اصلیت کا چہرہ زیبا کی ایک جھلک دیکھنا بھی محال ہے۔ پھر بھی حقیقت حقیقت ہے اور فسانہ دروغ فسانہ دروغ۔

خود جرجی زیدان اور انگریز مصنفین نے شیخ محمد احمد کی تحریک کے عقاید و اعمال ان کی حکومت کے قواعد و ضوابط کی جو تفصیلات قلمبند کی ہیں ان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مہدوی تحریک فی الحقیقت ایک نہایت پاک و مقدس اور دینی و شرعی تحریک تھی۔ سب سے اول شیخ کی اپنی زندگی ہے۔ جو اول سے آخر تک یکساں طور پر دینی اور پرہیزگاری و اتقا کی زندگی ہے۔ ان کے زہد و ریاضت اور ان کے طرز بود و ماند میں اس وقت بھی کوئی کمی اور تغیر نہیں آیا۔ جب وہ پورے سوڈان کے امیر المسلمین تھے اور یہی حال ان کے پیروؤں کا تھا۔ لوگ سر سے پیر تک شریعت اسلامی کی اتباع کے پیکر تھے ان کے عقائد خالص اسلامی تھے۔ ان کے اعمال خالص دینی تھے۔ ان کی معاشرت قطعاً شرعی تھی۔ البتہ ان کی زندگی میں ایک "غیر اسلامی" انقلاب آگیا تھا اور وہ یہ تھا کہ وہ برطانوی حکومت کی اطاعت سے یکسر منکر ہو گئے تھے۔ اور گرد و پیش کی اسلامی

دنیا کے طرزِ عمل کے خلاف وہ نصاریٰ سے مرعوب نہیں رہے تھے۔ ان کی مٹھی بھر تعداد نے ساری دنیا کو چیلنج دیا۔ اور چند ہی برس میں انگریزی حکومت کے جاہ و جلال کو فنا کر کے رکھ دیا۔

اس کے بعد مہدوی نظامِ حکومت ہے۔ شیخ نے اس کے تین حصے کئے تھے۔ سپاہ قضاء اور مالیات۔ سپاہ سالار عبداللہ تعاشی تھا اور قاضی الاسلام احمد بن علی جو پہلے دارفور میں قاضی تھا۔ مالیات کے لئے بیت المال قائم کیا جس میں عشر، مالِ غنیمت، زکوٰۃ، فطرہ اور جرمانے کی رقمیں جمع ہوتی تھیں۔ قانونِ شریعت ملک کا قانون تھا۔ اور رعایا مہدوی امارتِ اسلامی میں اتنی خوش اور مطمئن تھی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ ظلم و طغیان عنقا ہو گیا۔ بندوبست کا امتیاز اٹھ گیا۔ جبر و تشدد، رشوت خواری اور زبردست آزاری ختم ہو گئی۔ کسی عاملِ حکومت کی مجال نہ تھی کہ کسی کو ستا سکے۔

شیخ وقتاً فوقتاً سرکاری اعلان شائع کرتے رہتے تھے۔ سنہ ۱۳۰۱ھ میں ابیض سے ایک اعلان شائع کیا گیا تھا جس میں لوگوں کو کتاب و سنت کی پیروی، جہاد کی ترغیب ہجرت الی اللہ کی دعوت اور اتقاء و خشیتِ الٰہی کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کرنے کے بعد حسنِ اخلاق کی تلقین کی گئی تھی۔

مہدوی امارت کی حدود میں فحش گفتگو کرنے کی ممانعت تھی۔ کسی مسلمان کی مجال نہ تھی کہ کسی مسلمان کو سؤر، کتا یا یہودی نصرانی۔ کافر یا لوطی کہہ سکے۔ اس کی سزا اسی کوڑے تھی اور سات روز کی قید۔ کوئی مردِ غیر محرم عورت سے اختلاط یا گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ حرام فعل پر قسم کھانا منع تھا۔ حقہ اور تمبا کو پینا روک دیا گیا تھا۔ اس کی خرید و فروخت تک بند تھی۔ شرابی کی سزا اسی کوڑے تھے۔ خواہ وہ ایک قطرہ شراب ہی پیئے۔ عورتوں پر پردہ واجب تھا۔ ۵ برس کی بچی کی ستر پوشی لازمی تھی۔ زنا کی سزا قتل تھی۔ قتل کی سزا میں وارث کو قصاص اور دیت کا اختیار تھا۔ عورتوں کو خلع کا حق تھا۔ ان پر بھی جہاد واجب تھا۔ ان کا جہاد یہ تھا کہ جو عورتیں شہر سے باہر نکل سکتی ہیں دست و بازو سے جہاد کریں جو نہیں نکل سکتیں وہ گھروں میں پاک زندگی بسر کریں۔ مہدی کا اعلان تھا کہ خدا کی

راہ میں ایک مسلمان کا تلوار کو حرکت میں لانا ستر برس کی عبادت سے بڑھ کر ہے۔ شیخ نے سوڈان کی سرزمین کو عدل و انصاف سے بھر دیا تھا بعد اس کے کہ وہ ظلم و فساد سے بھر گئی تھی اور اس حدیث کی عملی تصدیق کر دی تھی جو مہدی علیہ السلام کے متعلق احادیث کی کتابوں میں وارد ہوئی ہے یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کی امارت کا آغاز ٹھیک سنہ ۱۳۰۰ھ میں یعنی چودھویں صدی کے آغاز پر ہوا چنانچہ ان کا اولین منشور جو ۱۲ رجب سنہ ۱۳۰۰ھ کو شائع ہوا اس میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ

"جو معاملات ۱۲ رجب سنہ ۱۳۰۰ھ سے پہلے کے ہیں سوائے امانت قرض اور مال یتیم کے سب اٹھا لیے گئے اور ان کے متعلق کسی سے باز پرس نہ ہوگی۔"

اس لئے کہ مہدوی دور کا یہ آغاز تھا۔ اور اس سے پہلے کے معاملات پر گرفت اور سرزنش درست نہ تھی شیخ کے پیروؤں کے حالات و معاملات بھی نہایت تسلی بخش تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند۔ پاکباز و شریف۔ نیک و متقی۔ مجاہد و جری اور سادہ معاشرت کے عادی۔ مذہبی عقاید کے اعتبار سے بھی مہدی کی تعلیمات میں کوئی بدعت نہیں ملتی۔ بلکہ انہوں نے فرقہ بندی کے اختلافات بھی ختم کر دیئے تھے۔ چاروں ائمہ کی تعلیمات کو جمع کر دیا تھا۔ مساجد میں درس قرآن ہوتے تھے۔ بیاہ شادی کی تقریبات میں سادگی پیدا کر دی گئی تھی۔ مہر کی مقدار مقرر اور ولیمہ کے اسراف بند کر دیئے تھے۔ رقص و سرود اور لہو و لعب کی سخت ممانعت تھی۔

آپ کے دشمنوں نے ان پر حج کعبہ کی ممانعت کا الزام لگایا ہے لیکن یہ درست نہیں۔ ان کے منشوروں میں اس قسم کا کوئی حکم نہیں ملتا۔ بالکل ممکن ہے کہ مسلسل جہاد اور مصری حکومت اور انگریزی حکومت کی جنگ آزمائی کے باعث مہدوی حج کو نہ جا سکتے ہوں اور ان کے مخالفین نے ان پر تہمت تراش دی ہو۔

مہدوی مملکت کی حدود میں فسق و فجور اور بددیانتی کا قلع قمع ہو گیا تھا۔ اور ہر طرف قال اللہ قال الرسول کے چرچے تھے شیخ محمد احمد کے حالات کا مطالعہ کرنے سے

معلوم ہوتا ہے۔ کہ مہدی علیہ السلام کے متعلق جو اخبار احادیث میں آئی ہیں۔ ان کا اتنا بڑا حصہ ان پر منطبق ہے۔ کہ ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی مدعی مہدویت پر چسپاں نہیں ہوتا۔

۱۔ ان کا نام محمد احمد تھا۔

۲۔ ان کے باپ کا نام عبد اللہ اور ان کی ماں کا نام آمنہ تھا۔

۳۔ انہوں نے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور کامیاب ہوئے۔

۴۔ انہوں نے سوڈان میں خالص اسلامی حکومت کا نظام قائم کیا۔

۵۔ ان کی حکومت میں زمین عدل سے بھر گئی تھی۔ حالانکہ وہ اس سے قبل ظلم سے بھری ہوئی تھی۔ واضح ہو کہ ان سے قبل سوڈان میں جو حالت تھی۔ اس کی مثال دنیا کے کسی اسلامی ملک میں نہیں ملتی تھی۔ سوڈانیوں کو غلام بنا کر بیچا جا رہا تھا۔ وہ نہ صرف محکوم تھے بلکہ صحیح معنی میں غلام تھے۔ مہدی نے ایسی سرزمین کو نہ صرف آزاد کیا۔ بلکہ اس کے باشندوں کو بھی غلاموں کی طرح فروخت ہونے سے نجات دلائی اور یہ مہدوی جہاد ہی کا نتیجہ ہے۔ کہ سوڈان میں بردہ فروشی ختم ہو گئی اور تمام امیر و غریب کا مرتبہ یکساں ہو گیا۔ فی الحقیقت شیخ کی زندگی اس دور کی ایک معجزانہ زندگی ہے۔

۶۔ شیخ اپنے مشن میں اپنی زندگی ہی میں کامیاب ہوئے اور چند سال ہی میں مظفر و منصور ہو کر امیر المسلمین بن گئے اور کامیاب و کامگار دنیا سے اٹھے۔ انہوں نے مئی ۱۸۸۱ء میں رمضان کے ماہ مبارک میں جہاد و غزا کا وعظ شروع کیا۔ اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو دنیا کی سب سے کمزور اور پسماندہ اور مجبور قوم کی طرف سے مقابلے کے لیے للکارا اور ۲۶ جنوری ۱۸۸۵ء میں وہ برطانیہ کو شکست دے کر سوڈان سے خارج کر چکے تھے۔

امیر عبد القادر الجزائری

شمالی افریقہ کی اسلامی سلطنتیں ایک ایک کر کے ٹتنی چلی گئیں۔ الجزائر۔ مراکش اور طرابلس یکے بعد دیگرے یورپ کی استعمار پرستانہ جوع الارضی کا شکار ہو گئیں۔ اور آج ان کی داستان ایک قصہ پارینہ کی طرح مسلمانوں کے دل سے محو ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۸۳۰ء میں جب شاہ فرانس فلپ لوئیس نے تخت نشین ہوتے ہی الحاق جزائر کا اعلان کیا، تو الجزائر کے جلنے والے چراغ حریت نے ایک آخری سنبھالا لیا۔ یہ امیر عبد القادر الجزائری ایسے جانفروش، وطن پرست کا ظہور تھا۔ جس کے تہور و شجاعت، عزم و استقلال اور فوجی و دینی زندگی کے یکساں اعلٰے اوصاف نے ایک سال کے اندر مسیحی دنیا کو انگشت بدنداں کر دیا۔

حق و باطل کی پہلی ٹکر

الجزائر کے بدوی قبائل میں آپ کا خاندان اثر و رسوخ اور دین و امارت کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ فرانس کے عیسائی گورنر نے جب رجوع خلائق کا یہ عالم دیکھا تو وہ اس خاندان کے استیصال پر تل گیا اور جلا وطنی کے احکام صادر کر دیئے۔ اس وقت آپ کی عمر بہت چھوٹی تھی۔ چوبیس برس کی عمر میں جب آپ وطن واپس آئے۔ تو ملک کی حالت بدل چکی تھی۔ ہر طرف خونریزی اور سفاکی کا بازار گرم تھا اور فرانسیسی درندے تمام الجزائر میں پھیل گئے تھے۔

بیعت جہاد

یہ حالت دیکھ کر آپ کا جی بھر آیا۔ آزادی اور خود مختاری کی گرمی اب تک الجزائری خون میں باقی تھی۔ تمام قبائل کو جمع کر کے غیرت دلائی اور حفظ وطن کے لیئے جہاد دفاع پر بیعت لی۔ اس وقت الجزائر میں فرانس کے ہاتھ پاؤں نہایت توانا تھے۔ چالیس ہزار سے زاید صرف پیادہ فوج تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی اور چار ہزار سواروں کی تلواریں ان کے علاوہ بے نیام تھیں۔ ساحل پر جنگی جہازوں کا ایک مہیب بیڑا لنگر انداز تھا۔ جس میں ۵۵ جنگی کشتیاں اور ۲۰ م۳ چھوٹے جہاز تھے اور یہ سب کئی سو قلعہ شکن توپوں اور بے شمار سامان جنگ سے لدے ہوئے تھے۔

اس کے مقابلے میں امیر عبدالقادر گویا بالکل نہتے تھے۔ بدوی قبایل کی ایک بے قاعدہ جماعت آپ کے اردگرد تھی۔ آلات جنگ کا کوئی ذخیرہ نہ تھا اور جو تھے وہ جدید آلات کے مقابلے میں بیکار تھے۔ سب سے زیادہ یہ کہ کوئی عمدہ اور محفوظ مقام بھی قبضے میں نہ تھا۔ اور دشمن تقریباً تمام اطراف ملک میں پھیلا ہوا تھا لیکن کوئی قوم خواہ کیسی ہی گہری نیند کیوں نہ سورہی ہو۔ اگر آزادی اور حکومت کے خواب کو بھلا نہ چکی ہو تو ایک ناتواں سی آواز بھی اس کے جگانے کے لئے کافی ہے۔ اسلام نے حفظ وطن کی روح جہاد دفاعی کے نام سے اپنے پیروؤں میں ودیعت کی ہے اور اگر زمین شور نہ ہو تو اس کا بیج بیکار نہیں جا سکتا۔

آغاز جہاد امیر عبدالقادر کی صدائے حرب نے تمام الجزایر میں یکایک آگ لگادی۔ سرداران قبایل چاروں طرف سے آ آکر جمع ہوتے تھے اور شوق شہادت میں آتشیں گولوں سے کھیلتے تھے۔ خود امیر عبدالقادر شجاعت و بسالت کی ایک آہنی دیوار بن کر فرانس کی خوفناک طاقت کے سامنے ڈٹ گئے۔ تھوڑے ہی عرصے کے اندر حملہ آور اپنا تمام قیمتی سامان اور مہیب فوج جہاد کی خون آشام تلواروں کی نذر کر کے مبہوت و سراسیمہ اور مایوس و نامراد گئے۔

سرفروشانہ مساعی یورپ میں جب فرانس کی ہزیمتوں کی خبریں شایع ہوئیں تو ڈیوک آف ولینگٹن تک کو الجزایر کی عظمت کا اقرار کرنا پڑا۔ آٹھ نو سال کے اندر آپ نے تقریباً الجزایر پر قبضہ کر لیا تمام ساحلی اور اندرونی قلعے فرانسیسی اقتدار سے آزاد ہو گئے۔

۱۸۳۵ء سے ۱۸۳۸ء چار سال تک فرانسیسی فوج کو لگاتار ہزیمت و شکست ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۸۳۷ء کے حملہ میں تیس ہزار کی جرار صفیں قسطنطنیہ کے میدان میں اس طرح فنا ہو گئیں۔ گویا مسلمانوں کے طلسم نے ان کے دست و پا شل کر دیئے تھے۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن چراغ میں جب تیل نہ ہو تو فتیلے کی تنہا فنا پذیر ہستی کب تک قائم رہ سکتی ہے؟ فی الحقیقت الجزائر کا ہزار سالہ ایوان عظمت گر چکا تھا۔ باہمی نا اتفاقیوں، ظلم اور

بداعمالیوں کے جراثیم نے اس کے چوبی ستونوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ امیر موصوف نے جو کچھ کیا گویا سہارا دے کر گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالنا تھا۔ سب سے بڑی چیز مرکز کی طاقت ہے۔ ان تمام چھوٹی بڑی حکومتوں کا قلب خلافت عثمانیہ تھی لیکن یہ وہ وقت تھا جب خود قصر خلافت کی بنیادیں ہل چکی تھیں اور ترکی داخلی مشکلات میں گھر کر بیرونی حکومتوں کا سہارا ڈھونڈھ رہا تھا اسے اپنی گرفتاریوں سے کب مہلت تھی کہ الجزائر کی طرف گردن پھیرتا؟

آخری مدافعت

۱۸۴۱ء میں مارشل بوگیڈ ۸۰ ہزار یورپ کے انسان صورت درندوں کا غول لے کر روانہ ہوا اور ساحل پر قدم رکھتے ہی خونخوار بھیڑیے کی طرح ظلم وسفا کی شروع کر دی قتل و غارت کے سوا اور کوئی لفظ اس کی زبان پر نہیں چڑھتا تھا۔ ایک دو ماہ کے اندر اس زرخیز مملکت کا یہ حال ہوا کہ تمام شہر جل کر خاکستر کا ڈھیر تھے۔ ایک آبادی کو غارت کر چکتا تھا تو ناتواں عورتوں اور معصوم بچوں کی خونچکاں لاشوں کو روندتا ہوا دوسری آبادی کی طرف رخ کرتا تھا۔

شکست و صلح

ہتھیار ڈالنے کے سوا اب کوئی چارہ کار نہ رہا تمام قبائل و شیوخ کو اپنی بدبختی کے آگے سر جھکانا پڑا لیکن جو نلوار اعلائے ملت کے دنوں میں اٹھنے کے لئے بلند ہوئی تھی مشکل تھا کہ آزادی وطن کی امیدوں کو قتل کر کے آسانی سے جھکا دی جاتی بطل حریت امیر عبدالقادر اطاعت کے لئے تیار نہ ہوئے اور الجزائر سے مراکش چلے گئے وہاں کچھ دنوں تک اپنی جمعیت بہم پہنچاتے رہے پھر ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۳ء میں متواتر فرانسیسی فوج پر دوبارہ حملہ کیا لیکن قسمت کی کمان سے نامرادی کا جو تیر چل چکا تھا وہ نشانے پر بیٹھا اور دونوں مرتبہ حریف کو نقصان پہنچانے کے بعد خود شکست کھانی پڑی۔ بالآخر جب ہر طرف سے مجبور ہو گئے تو ڈیوک آل سے صلح کرنے کے سوا اور کوئی راہ نظر نہ آئی صلح کی پہلی شرط یہ تھی کہ امیر سے بالکل تعرض نہیں کیا جائیگا۔ اور اسکندریہ یا عکّا جانے کی اجازت دی جائے گی لیکن مسیحی تہذیب میں عہد کی پابندی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ انگلستان نے نپولین کے ساتھ واٹرلو میں جو معاہدہ کیا تھا۔ ویسا ہی معاہدہ تعتیعہ کے میدان میں آپ سے بھی کیا گیا۔

فرانسیسیوں کی بدعہدی

یہ معاہدہ نقش بر آب ثابت ہوا اور جیسے ہی امیر عبدالقادر

نے تلوار نیام میں رکھی۔ معاً قید کر کے آپ کو فرانس بھیج دیا گیا۔ تہذیب کے ان پجاریوں نے یہیں تک بس نہیں کی بلکہ آپ کے خاندان اور حرم کی عورتوں کی بے حرمتی کر کے وحشت و بربریت کا ثبوت دیا۔

اس منظر کی تصاویر کئی سال تک پیرس کے ایوانوں کی آرائش رہیں۔ پانچ سال تک سخت سے سخت اذیتیں جو کسی قیدی کو یورپ کے قید خانوں میں دی جا سکتی ہیں وہ سب اس وطن پرست کو نصیب ہوئیں۔

رہائی جب الجزائر کی تمام ملکی طاقت فنا کر دی گئی اور خوف وہراس کا کانٹا دل سے نکل گیا تو رحم دل لوئیس نپولین نے آپ کو آزاد کر دیا پہلے آپ بروسہ گئے۔ پھر کچھ دنوں اور ملکوں کی خاک چھانی۔ دل کی سراسیمگی اور روارفتگی نے ہر جگہ برہم شفتہ رکھا بالآخر دمشق میں گوشہ نشینی اختیار کی۔

وفات ۱۸۸۳ء میں الجزائر کی ہزار سالہ عظمت اور اسلامی جبروت کی طرح اپنے وجود کو سپرد خاک کر دیا اور اسلامی عروج و زوال کے ہزاروں افسانوں میں اپنی ایک چھوٹی سی کہانی کا اضافہ کر گئے۔

مجاہد طرابلس امیر علی پاشا

ابتدائی حالات گذشتہ اوراق میں آپ امیر عبدالقادر الجزائری کے حالات ملاحظہ فرما چکے ہیں تاریخ عالم میں ہم ہمیشہ سے دیکھتے آرہے ہیں۔ کہ بعض ہستیاں مرنے کے بعد بھی کسی صورت میں زندہ رہتی ہیں۔ چنانچہ امیر عبدالقادر الجزائری کی روح جہاد نے آپ کے خلف ارجمند امیر علی پاشا کی شکل میں یورپ کی استعماری طاقتوں کو مدتوں انگشت بدنداں رکھا۔ امیر مرحوم کی تمام صفات امیر علی پاشا میں موجود تھیں۔ اور ان کی جانفروشیوں اور شجاعانہ حملوں سے الجزائر کے جہاد حریت کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔ آپ کی جدوجہد

کا میدان طرابلس کا میدان جنگ تھا۔ اس لئے آپ کو صحیح طور پر طرابلس کا بطل حریت کہنا چاہیئے۔

طرابلس پر اطالوی یورش

اٹلی نے فرانس کے نقش قدم پر گامزن ہوتے ہوئے شمالی افریقہ کی دوسری نوآبادی "طرابلس" کو اپنا نشانہ ستم بنایا۔ چونکہ اٹلی نے یکایک طرابلس پر حملہ کر دیا تھا۔ ترکی کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور ترک اندرونی کشمکش میں گرفتار تھے۔ ادھر مصر نے برطانوی سیادت کے زیر اثر غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ اور ترکی سے طرابلس جانے کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ اس لئے ترک براہ راست طرابلس کی کوئی امداد نہ کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود غازی انور پاشا اور ان کے رفقاء کار پوشیدہ طور پر طرابلس جا پہنچے اور انہوں نے اعراب طرابلس کو جہاد حریت کے لئے تیار و آمادہ کر لیا۔ شیخ سنوسی نے اس سلسلے میں بڑی جانفشانی سے کام کیا اور امیر علی پاشا کی اسلامی حمیت و غیرت بھی عربوں کی بے بسی و بے کسی پر جوش میں آئی اور آپ نے طرابلس کے میدان جنگ کو اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔

جہاد کی تڑپ

اعلان جنگ کے موقع پر امیر موصوف شام میں مقیم تھے۔ انہوں نے اسی وقت ایک عرضداشت سلطان المعظم کی خدمت میں بھیجی۔ اور طرابلس جانے کی اجازت چاہی۔ عرضداشت کے آخری الفاظ یہ تھے:۔

"میرے والد مرحوم امیر عبد القادر نے فرانس کا تیس سال تک مقابلہ کیا تھا یقین فرمایئے کہ کم از کم پندرہ سال تک تو میں طرابلس کی خاک کو ہاتھ سے نہ جانے دوں گا"

آپ کے پہنچتے ہی مجاہدین میں ہمت و شجاعت کی حیات تازہ ہو گئی اور تمام قبائل طرابلس نے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ آپ کے جوش جہاد اور حب ملت و وطن کا یہ حال تھا کہ جس دن اپنی جماعت کو لے کر طرابلس پہنچے۔ بغیر کسی آرام و توقف کے مصروف پیکار ہو گئے۔ صبح کی تاریکی میں نعرہ ہائے اللہ اکبر کی ایک نئی گرج نخلستان بنغازی سے ہیبت اٹھی اور طوفان ہلاکت بن کر لشکر کی قیام گاہ پر نمودار ہوئی۔ یہ گویا ایک جلیل القدر

مجاہد کے پہنچنے کی سلامی تھی جس نے حریف کی چھاؤنیوں میں زلزلہ ڈال دیا۔ اسی زمانے میں دنیا بھر کے اخبارات میں کارزار طرابلس کی خبریں شائع ہوتی تھیں ان میں آپ ہی کی شجاعانہ سرگرمیوں کا زیادہ ذکر ہوتا تھا۔

معرکہ بنغازی

بنغازی کے اولین معرکہ میں آپ نے جس شجاعت و تہوّر کا ثبوت پیش کیا اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں ناپید ہے وہ صبح کی تاریکی میں اپنے ساتھیوں اور مجاہدین طرابلس کی مختصر سی جماعت لے کر چل کھڑے ہوئے مجموعی تعداد تین سو سے زیادہ نہ تھی اور منزل مقصود بغیر متعین۔ کیونکہ اسی شب کو یہ قافلہ طرابلس پہنچا تھا اور دشمن کی نقل و حرکت سے بے خبر تھے۔ شوق شہادت و ولولہ شجاعت نے اتنی مہلت نہ دی، کہ کسی مناسب حملے یا اتفاقی مقابلے کا انتظار کیا جائے۔ بغیر کسی علم و انتظام کے دشمن کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔

پوری جماعت تین حصوں میں منقسم ہو گئی۔ اور سو مجاہدین کا صرف ایک دستہ تجسس و تلاش میں آگے بڑھا۔ تھوڑی مسافت ابھی طے کی تھی۔ کہ گھوڑوں کی ٹاپوں اور ہتھیاروں کی جھنکار نے بتلا دیا کہ ان کی منزل مقصود یہی ہے۔

دشمن کی تعداد تین ہزار تھی۔ ایسی حالت میں محفوظ طریقہ تو یہ تھا کہ کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھ جاتے اور دشمن بے خبر آگے بڑھ جاتا۔ تو عقب سے حملہ آور ہو کر مقابلہ کے بعد آگے بڑھ جاتے لیکن اس باحمیت مجاہد نے جہاد کے مقدس میدان میں اپنی اولین ضرب شمشیر کو بزدلانہ کام میں لانا پسند نہیں کیا۔ پوری جماعت وہیں کھڑی ہو گئی اور صبح کی نورانی فضا میں جانداگان راہ شہادت نصرت الٰہی کا انتظار کرنے لگے۔

بےخوف مجاہد کی شان عبودیت

دو ہزار مسلح دشمنوں کا گروہ چند لمحوں کے اندر نمودار ہونے والا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز اور ہتھیاروں کی جھنکار اب صاف صاف سنائی دینے لگی تھی لیکن یہ نازک وقت بھی خوف و ہراس یہ منظر دہشت و اضطراب بھی اس مومن مخلص کو خالق ارض و سما کی عبادت سے باز نہ رکھ سکا وہ اپنی مختصر سی جمعیت کے ساتھ نماز میں مصروف ہو گیا۔

اللہ اکبر! یہ بھی کیا منظر تھا کہ ایک طرف تو بے نیام تلواریں اور بندوقوں کی کرچیں فضا میں چمک رہی تھیں اور دوسری طرف وہ گردنیں جنہیں دشمنوں کی کوئی طاقت جھکا نہیں سکتی تھی بجودانہ درگاہ الٰہی میں جھک گئیں جھکی ہوئی قرن اولیٰ کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ امیر علی پاشا اپنے پچاس ساتھیوں کے ہمراہ نماز میں مصروف تھے اور پچاس مجاہد حفاظت پر معمور تھے۔ یکایک دشمنوں کا گروہ عظیم نمودار ہوا۔ اس کی کثرت تعداد ضروریات جنگ سے تکمیل ہر طرح کی آمادگی و مستعدی سے معلوم ہوتا تھا کہ محض فوجی نمائش نہیں بلکہ ایک سخت حملے کا آغاز ہے۔ دشمن نے اتنی قلیل جماعت کو سامنے دیکھ کر اور ان میں سے بھی نصف کو مصروف پاکر زور سے غلغلہ شادمانی بلند کیا۔

لیکن مجاہدین کے بیباکانہ نعرہ اللہ اکبر کی گونج نے ان کے نعرہ ہائے مسرت کو زیادہ مہلت نہ دی۔ وہ ابھی کسی قدر فاصلے پر رک کر سنبھلے بھی نہ تھے۔ کہ پچاس مجاہدوں نے برق کی سرعت سے لپک کر حملہ کر دیا۔ گویا چھوٹی چھوٹی پچاس کشتیاں تین ہزار سپاہیوں کے سیلاب میں تیرنے لگیں۔ ان کی اس جسارت اور تیزی نے تھوڑی دیر کے لئے تمام لشکر کو مبہوت کر دیا اور حیرت و تعجب نے سب کے ہاتھ شل کر دیئے۔ اس عرصے میں پچاس ضربوں نے اپنے سے دو چند تعداد کا خاتمہ کر دیا تھا۔

مقابلۂ آہن و آتش

ہنگامہ رستخیز بلند اور شور دار و گیر سے صحرا گونج رہا تھا۔ مگر نماز پڑھنے والوں نے پوری جمعیت خاطر سے نماز ختم کی اور امیر علی پاشا اپنے پچاس ساتھیوں کے ان دولہ شہادت اور جوش جہاد کے ساتھ جس کے اضطراب نے انہیں رات بھر انتظار کرنے کی بھی مہلت نہ دی تھی۔ دوسری مرتبہ تکبیر جہاد بلند کرتے ہوئے پیام موت بن کر صف اعدا پر ٹوٹ پڑے۔

سو سو مجاہدین کی جن دو جماعتوں کو مختلف اطراف میں بخیال طاقت محفوظ بھیج دیا گیا تھا۔ جنگ کی آواز سنتے ہی ان میں سے پہلا گروہ بھی نعرۂ تکبیر سے دلوں کو لرزاتا ہوا آموجود ہوا اور اب دو سو مجاہدین مصروف پیکار ہو گئے۔ علی نظمی[۱] بے جو قسطنطنیہ سے مرکزی ہلال احمر

---

[۱] علی نظمی بے مکتب حربیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ کہ یکایک حکومت اطالیہ نے ترکی کے رباتی حقف پر

کے پہلے وفد میں روانہ ہوئے تھے۔ زین طرابلس کے اس جانباز مجاہد کے حیرت انگیز کارنامے ان الفاظ میں قلمبند کیئے تھے:۔

"اگر شجاعت و جانفروشی، عزم و استقلال، وطن پرستی اور حفظ ناموس ملت و وطن کا خون قیمتی ہے تو دنیا میں کون حساب کر سکتا ہے کہ طرابلس کی خاک کے ذروں کی کیا قیمت ہوگی؟"

"امیر علی پاشا کے پہلے معرکے میں ۲۰۰ انسان ان تین ہزار تربیت یافتہ سواروں سے بےخوف ہراس لڑ رہے تھے۔ یہ کیا شیشے کا پہاڑ کی چٹان سے سر ٹکرانا تھا؟ حیران ہوں کہ جو کچھ میں دیکھتا ہوں بیسویں صدی کی مادی فضا میں پرورش پانے والی دنیا کو کیونکر اس کا یقین دلاؤں؟ اگر میں کہوں کہ شیشہ و سنگ کے تصادم میں آخرالذکر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو یقیناً میں پاگل کہلاؤں گا مگر میں کہتا ہوں کہ دو سو صحرا نشین بدویوں نے یورپ کے تین ہزار تربیت یافتہ سپاہیوں سے کامل چار گھنٹے تک آگے بڑھنے کی طاقت سلب کر لی اور بالآخر شکست دی۔"

علی بک اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اس معرکہ میں امیر عبدالقادر کا خلف الرشید اول سے آخر تک ایک وجود طلسم تھا۔ انسان خواہ کچھ ہو لیکن فولاد یا پتھر کی چٹان نہیں اور اگر پتھر کے دو ستون بھی ہوں تو بھی تین ہزار گولیوں کی مسلسل بارش ان کو تھوڑی دیر میں جالی کی چادر بنا دیتی ہے لیکن یہ صرف امیر علی پاشا کا حسن تد

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹:۔ خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ان کی عمر ۱۵ سال تھی لڑائی کی خبر نے انہیں بےچین کر دیا انجمن ہلال احمر کے دفتر میں پہنچے اور کہا کہ مجھے میدان کارزار میں داد شجاعت دینے کا موقع دیا جائے عثمانی کیمپ کے متعلق افسر نے پوچھا تو بتایا کہ والدین فوت ہو چکے ہیں۔ صرف ایک چچا باقی ہے۔ عزیزوں سے وقتاً فوقتاً حاصل کر کے آٹھ پونڈ کی رقم جمع کی ہے اور کپڑوں کے تین جوڑے موجود ہیں۔ جب طرابلس جانے کا مقصد پوچھا گیا تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ "دفاع وطن اور خدمت ملت پیش نظر ہے"۔ لوگوں نے جب آپ کی معصوم صورت دیکھی اور آپ کے ارادوں پر نظر کی تو بہت سے روئے اور بہتوں نے ہنس کر حیرت کا اظہار کر دیا۔ بعض نے اسے بچپن کا کرشمہ قرار دیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہاں گولیاں چلتی ہیں توپیں آگ اگلتی ہیں۔ جواب دیا کہ میں اس جگہ جانے کیلئے بیقرار ہوں جہاں میری ماں میرے باپ اور ہم سب کا خدا ہوگا۔ ان کے بچپن کو جب بر حال معلوم ہوا تو دوڑا ہوا آیا اور چیخ مار کر رونے لگا لیکن نظمی بے اپنے ارادے کے پکے اور ہٹ کے پورے تھے باز نہ آئے۔ آخر ایک ہفتہ کے بعد مکتب پر اسی رفیق پر غائب ہو گئے اور کئی ماہ جہاد طرابلس میں شریک رہ کر شہید ہو گئے۔ عارف بک نے جنہیں دنیا عارف پاشا کے نام سے یاد کرتی ہے علی نظمی بے کے واقعہ کو ان الفاظ میں دنیائے اسلام میں نشر کیا "پندرہ برس کے علی نظمی کو اگر ہلال احمر کا دفتر نہ بھولا ہو تو بہ عنایت اسکو خبر دیدیجئے کہ وہ اپنے ماں باپ اور اپنے خدا کے پاس پہنچ گیا جس کے لئے وہ بہت بیقرار تھا۔"

تھا اور ان کی بے جگری تھی کہ اڑتے آگئے۔ اور یہ سپاہی دشمنوں کے سمندر میں مچھلی کی طرح بے خوف و خطر تیرنے لگے۔

خود امیر علی پاشا کا یہ حال تھا کہ میدان جنگ میں چند لمحوں کے لئے بھی اس کی جگہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رعد کی گرج کی طرح پیہم نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتا اور پھر برق کی سرعت سے چمک کر دوسری جگہ نمودار ہو جاتا۔ گویا ہمت و شجاعت نے اس کے دونوں طرف پر لگا دیئے تھے جس سے اس فضائے خونین میں ہر طرف بے خوف و ہراس اڑتا تھا۔ اور بندوقوں اور رائفلوں کے نشانے اس کی سرعت پرواز کا ساتھ دینے سے عاجز تھے۔

ایک مرتبہ پندرہ بیس منٹ گزر گئے اور وہ کسی طرف نظر نہیں آیا۔ ساتھیوں کو جب یقین ہو گیا کہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ افسر کی موت کا یقین ہمیشہ سپاہیوں کی ہمت پست کر دیتا ہے اور اکثر موقعوں میں بڑی بڑی فوجوں کو صرف ایسے ہی اتفاقات سے ہزیمت ہوئی۔ مگر مسلمان مجاہد کا یہ جذبہ دیگر خصوصیات کی طرح اس بارے میں بالکل برعکس ہے۔ شیر کی شکست اس کی فتحیابی سے زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ اسی طرح مسلمان مجاہد کو شکست کا یقین اور زیادہ باہمت اور بے پروا کر دیتا ہے۔ جوں ہی مجاہدین کو اپنے امیر جماعت کی شہادت کا یقین ہوا۔ ایک نعرۂ تکبیر جس کی ہر گونج اپنے اندر شجاعت و دلیری کی ایک حیات تازہ رکھتی ہے بلند کر کے ایک آخری جان گسل حملہ کر دیا۔ کہ امیر لشکر کے بعد تو اب زندگی اور بھی کم ضروری ہو گئی ہے۔ یہ گویا بحر شجاعت کی دو سو موجوں کا طوفانی ہیجان تھا۔ جس نے تین ہزار ٹن کے اس اطالوی جہاز کو تہ و بالا کر دیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک جماعت صفیں درہم برہم کرتی ہوئی دور تک نکل گئی۔ تو دیکھا کہ امیر زندہ سلامت ایک تودہ ریگ کی آڑ میں موجود ہیں۔ البتہ دو گولیاں دولت شہادت کی سینے میں امانت ہیں اور گو زخمی ہو چکے ہیں۔ مگر قبضہ شمشیر کے دولاب کی برقی سرعت کسی انسانی ہستی کو قریب سے گذرنے نہیں دیتی۔

شہادت دشمنوں کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملاتا ہوا اور طرابلس کی آزادی و استقلال کو اپنے خون حیات سے سینچ کر شمالی افریقہ کے مرد مجاہد کا یہ مجاہد فرزند ہمیشہ کی نیند سو گیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

طرابلس کی معصوم مجاہدہ "فاطمہ"!

قرن اولیٰ کی ایک جھلک

غزوہ طرابلس کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ صدیوں کے بعد اس نے قرن اولے کے غزوات و مجاہدات کے واقعات زندہ کر دیئے اور مدتوں کے بعد بادیہ نشینوں کو موقع ملا کہ ان کے اصل جوہر نمایاں ہوں۔ بدر اور اسلام کے قصص میں ہم پڑھتے تھے کہ ایسی عورتیں تھیں جو اپنے آٹھ آٹھ لڑکوں کو اللہ کی راہ میں زخمی کر کے پھر خود بھی زخمی ہو جاتی تھیں اور اللہ کے رسول محبوب کی محبت و عشق میں ایسی محو تھیں کہ تیروں پر تیر کھاتی تھیں مگر اپنے جسم کو ان کے سامنے ڈھال کی طرح رکھتی تھیں خاک طرابلس نے تمام واقعات دہرا دیئے۔

عربی جنگ کی یہی خصوصیت عورتوں کی شرکت ہے۔ غزوہ طرابلس کے لئے جب اطراف و جوانب اور اندرون صحرا سے قبائل جمع ہونے لگے تو ہر قبیلے کے ہمراہ اس کا پورا خاندان ہوتا تھا۔ ان میں ہر طرح کی عورتیں ہوتی تھیں وہ نوجوان لڑکیاں بھی تھیں جن کے ابھی کھیل کود کے دن تھے۔ بڑھیا عورتیں بھی تھیں جن کے جسم کے قوائے جواب دے چکے تھے بہت سی عورتیں ایسی بھی ہوتی تھیں کہ ان کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور وہ ان کو الگ نہیں کر سکتی تھیں اسی حالت میں پانی کی مشک لئے ہوئے میدان جہاد کے زخمیوں کو ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔

شیخ عبد اللہ کا ولولہ جہاد

جن قبایل نے سب سے زیادہ جنگ میں حصہ لیا ان میں ایک مشہور قبیلہ (قبیلۃ ابراعصنہ) تھا جو کثرت نفوس اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے طرابلس کا سب سے بڑا قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔

اس قبیلے کا سردار شیخ عبد اللہ تھا۔ اس مجاہد غیور نے آغاز جنگ سے خالصاً لوجہ اللہ عظیم الشان خدمات جہاد انجام دیں۔ ترک افسر متفق اللسان تھے کہ اگر شیخ عبد اللہ کے عالی شانہ عزایم اول کار میں ساتھ نہ دیتے تو بعد کی کامیابیاں حاصل نہ ہو سکتیں

P, 69 & 72

فاطمہ بنت عبداللہ

ایک گیارہ سالہ عربیہ مجاہدہ جو میدان جہاد میں تشنہ لب زخمیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو گئیں

نوری پاشا برادر انور پاشا

علی لطفی بے

کارزار طرابلس کا پندرہ سالہ ترک شہید

غازی عبدالکریم　　　محمد بن عبدالکریم

کہ اس فدائے اسلام نے اپنے قبیلے کو ابھارا۔ اطراف و نواح کے دوسرے قبائل کو آمادہ جہاد کیا
اپنا تمام مال و متاع قوم کے سپرد کر دیا تمام عربوں کو بطور نفقہ جنگ کے روزینہ دیا جاتا تھا اسے
بھی قبول نہ کیا۔ پھر اپنے خاندان کے مرد و زن کو لا کر دشمنان اسلام کے مقابل صف آرا کر دیا ان
کو کٹوایا اور آخر میں خود بھی ان کی رفاقت اختیار کی۔

فاطمہ بنت عبداللہ

زیب عنوان فاطمہ اس غیور عرب شیخ عبداللہ کی گیارہ سالہ لڑکی تھی
سب سے پہلے اس معصوم پیکر کو اُس وقت دیکھا گیا جب پہلی
مرتبہ ترکی لشکر عزیزیہ سے نمودار ہوا۔ گیا عورتوں اور لڑکیوں کی لشکر میں کمی نہ تھی۔ کیونکہ ہر عرب
مع اپنے پورے خاندان کے شریک جہاد ہوا تھا۔ لیکن چند مخصوص باتیں فاطمہ میں ایسی نظر
آتی تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ ہزار ہا مردوں اور عورتوں میں بھی ممتاز تھی۔ اول تو اس کی عمر بہت
چھوٹی تھی۔ دوسرے اس کو جنگ اور جنگ کے زخمیوں سے کچھ ایسا انس ہو گیا تھا کہ سخت سے
سخت معرکوں میں بھی اس کی مسابقت اور پیش قدمی کو ہر سپاہی محسوس کرتا تھا۔ جنگ خواہ
جارحانہ ہو خواہ مدافعانہ، ساحلی بیڑے سے توپوں کی بارش ہو رہی ہو یا تلواروں اور سنگینوں
کے سامنے صفیں ہوں۔ مگر زخمی مسلمان کی آہ اس کے لئے ایک ایسی کشش تھی جس کو سن
لینے کے بعد محال ہو جاتا تھا کہ اس کی چھوٹی سی مشک اپنے فرض کو بھول جائے وہ کم سن تھی
لیکن اس کے اندر ایک کہن سال جذبہ موجود تھا۔ یہ ذوق لہو و لعب یا تمتعات حیات کا نہ تھا بلکہ
خون۔ زخم اور کٹی ہوئی انسانی رگوں کا جہاں کہیں یہ چیزیں موجود ہوتیں وہ ایک باد رفتار
ہرنی کی مستعدی اور فرشتہ عشق کے پروں پر اڑتی ہوئی پہنچ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ بارود کے
دھوئیں سے تمام فضا تاریک ہو رہی تھی۔ کانوں کے پردے توپوں کی سامعہ شکن صداؤں سے
پھٹ رہے تھے گولوں کے پھٹنے سے ایک عارضی روشنی نمودار ہو جاتی تھی مگر اس کے ساتھ
ہی انسانی اضطرار کی چیخیں پچھلی مہیب گرجوں کے ساتھ مل کر ایک عجیب وحشت انگیز ہنگامہ برپا
کر دیتی تھیں ایسے جگر پاش اور زہرہ گداز عالم میں اپنا اونچا کرتا پہنے ہوئے اور پھٹی ہوئی خمار کمر
کے گرد لپیٹے ہوئے اس طرح دوڑ رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا مظلوم و محتاج زخمیوں کی خبر گیری
کے لئے کوئی فرشتہ حسنات آسمان سے اتر آیا۔ اور قدرت نے ہوا اور زمین کو اس کے تابع

کر دیا ہے کہ وہ اٹھائے ہے اور یہ بھیلتی جائے۔ سامنے سے گولوں کی لگاتار بارش ہو رہی تھی مگر یہ اس بارش پر تیرتی ہوئی جاتی تھی اور زخمیوں کی پیاس بجھانے میں اس طرح محو ہو جاتی تھی کہ اسے اس قیامت خیز منظر کی خبر ہی نہیں۔ انسانی لاشیں ایک پر ایک گر رہی تھیں۔ لاش کے گرنے کی آواز خوف کی جگہ اس میں قوت کی نئی روح پیدا کر دیتی تھی وہ گرتے ہوئے جسموں پر بجلی کی تیزی سے پہنچتی اور ان کے تشنہ لبوں کے ساتھ اپنا ننھا سا مشکیزہ لگا دیتی۔ ایک ترک افسر اسماعیل بے جو اس اولوالعزم مجاہدہ کو تحیر سے دیکھ رہا تھا نہ رہ سکا خاموش آگے بڑھا۔ اور معصومہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔

"کیا تجھے نہیں معلوم کہ تو اپنے باپ کی ایک ہی بیٹی ہے؟"

"چھوڑ دو۔ کیا تم بھول گئے کہ اسلام اور وطن کے کتنے فرزند یہاں پیاسے دم توڑ رہے ہیں؟" یہ کہا اور نظروں سے غائب ہو گئی۔

وہ اکثر کہا کرتی تھی۔ کہ مجھ کو سرخ رنگ سے عشق ہے۔ آہ! یہی رنگ ایک دن اس کی گردن اور دل کے نیچے سے بہتا ہوا دیکھا گیا ۱۷ رجب ۱۳۳۱ھ کو زوارہ میں ۱۲ ہزار اطالویوں نے دو ماہ کی مسلسل طیاریوں کے بعد ایک بڑا حملہ کیا عین دوپہر کا وقت تھا۔ اطالوی توپخانہ دونوں جانب سے آگ برسا رہا تھا۔ دس ہزار بندوقوں کے چھوٹنے کی آواز ایک ہی وقت میں کڑک رہی تھی تمام ریگستان میں موت و ہلاکت کا طوفان بپا تھا۔ اس وقت اس بہشت زار شہادت کی حور عین فاطمہ بدستور اپنے ایک ہی کام میں مشغول تھی۔ اس کی دائمی رفیق مشک اس کی کمر پر تھی۔ دھوئیں اور تپش کی شدت سے چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ بالوں پر سرخی مائل ریت کی تہ جم گئی تھی کپڑے اس کے محبوب "سرخ رنگ" کے دھبوں سے رنگین تھے اور اپنی مخصوص مجنونانہ محویت کے پروں سے فضائے جنگ میں اڑ رہی تھی۔ اس کی ماں بھی اس خدمت میں شریک تھی۔ اس کا باپ بھی اپنے قبیلے کے ساتھ مصروف جانبازی تھا۔ عصر کا وقت جب قریب آ گیا تو مجاہدین آخری عزم کے ساتھ دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کی صفوں میں گھس کر تلوار دل سے کاٹنا شروع کر دیا۔ احمد نوری بے (برادر انور پاشا) ترکی کمان افسر اپنی جماعت لے کر دشمنوں کے مشرقی توپ خانہ تک بڑھتا ہوا چلا گیا۔ توپ خانہ کے پاس اطالویوں کی ایک تازہ دم

جماعت تھی، ایک چھوٹی سی جماعت دیکھ کر ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور تیس ترک سپاہیوں کو چاروں طرف سے گھیر کر بندوقوں کا نشانہ بنا دینا چاہا۔ نہیں معلوم کون محافظ ہاتھ تھا۔ جس نے عربی صفوں سے اس قدر دور فاطمہ کو پہنچا دیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جانباز ترک تلواروں کے بے امان ہاتھ مار کر نکل آئے ہیں۔ مگر چار زخمی ترک زمین پر پڑے ہوئے سسک رہے ہیں۔ نامرد اطالوی حریفوں کو تو روک نہ سکے۔ مگر زخمیوں کے سر و سینہ میں سنگینیں چبھو کر، بہا غصہ نکال رہے تھے۔ گیارہ برس کی فاطمہ دیکھتے ہی لپکی اور بغیر ان لوگوں پر نظر ڈالے جو پاس ہی کھڑے تھے اپنی مشک ایک زخمی کے منہ سے لگا دی۔ پورا ایک گھونٹ بھی اس زخمی کے حلق سے نہیں اترا تھا کہ دو اطالویوں نے بڑھ کر گردن کے پاس سے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ فاطمہ مڑ کر بڑی۔ مگر دشمن کی گرفت مضبوط تھی۔ فوراً فاطمہ نے زخمی ترک کی پڑی ہوئی خون آلود تلوار اٹھائی اور اس زور سے ماری کہ اطالوی سپاہی کا داہنا ہاتھ زخمی ہو کر لٹک گیا۔ اطالوی نے گردن چھوڑ دی تاکہ بائیں ہاتھ سے جواب دے۔

عرب اور ترک سپاہی جب دشمنوں کا تعاقب کرتے ہوئے میدان جنگ سے آگے بڑھے تو انہوں نے دیکھا کہ چار زخمی ترک زمین پر پڑے ہیں، پاس ہی فاطمہ کی لاش ہے مگر اس حالت میں کہ مشک کا حلقہ ہاتھ میں ہے اور مشک ایک بے ہوش ترک کے سینہ پر پڑی ہے۔ شاید مرنے دم بھی زخمی ترک کو پانی پلانے کی کوشش کی تھی مگر مشک اس کے منہ تک نہ لے جا سکی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اس واقعہ کو علامہ اقبال مرحوم نے ذیل کی دلاویز نظم میں پیش کیا ہے

فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیان دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے!
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعت مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں
تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موج نور
جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جن کی ضو ناآشنا ہے قید صبح و شام سے
جن کی تابانی میں انداز کہن بھی نو بھی ہے
اور تیرے کوکب تقدیر کا پرتو بھی ہے

صحرائے افریقہ کا درویش مجاہد

احمد شریف سنوسی

ابتدائی حالات

ہندوستان کی روحانیت کیش سرزمین کی طرح ریگزار افریقہ بھی تصوف کی تجلیوں سے معمور ہے۔ یہاں کے صوفیا میں سے سب سے مشہور "سنوسی درویشوں" کا گروہ ہے۔ یہ حضرات جہاں اقلیم روحانیت کے تاجدار ہیں، وہاں دنیاوی وجاہت سے بھی سرفراز ہیں بلاشبہ ان کے دل یاد حق سے معمور ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی بے نیام تلواریں میدان جہاد میں درخشاں نظر آتی ہیں۔ طرابلس کے مشہور مجاہد شیخ سنوسی انہیں بزرگوں میں سے ایک تھے۔ طرابلس کے خونیں میدان میں جب اٹلی کی بربریت برہنہ ہو رہی تھی۔ شیخ سنوسی کی صداقت آفریں آواز نے عربوں کو گرما دیا اور عین اس وقت جب ترکی حکومت نے طرابلس کو اپنے جوئے سے آزاد کر دیا تھا یہ انہیں سنوسی مجاہدوں کی بے قاعدہ فوج تھی جس نے اٹلی کے دانت کھٹے اور زہرے آب آب کر دیئے تھے۔ شیخ خود بھی ان معرکوں میں شریک ہوئے اور تیغ زنی کے جوہر دکھائے بہت مدت ہوئی۔ سید محمد سنوسی اپنے مرشد سعید احمد ادریسی کے حکم سے ولایت طرابلس پر معمور ہوئے تھے۔ ان کی جنگی خدمات اور جوش اسلامی کی وجہ سے عسیر کے لوگوں میں ان کا اثر و رسوخ اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ عسیر کی حکومت انہیں کے تصرف میں آگئی تھی۔ ان کی وفات پر شیخ احمد سنوسی جب وہاں پہنچے تو عسیر کی عنان حکومت نوجوان امیر علی ادریسی کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔

دو کارنامے

شیخ کی دوربین نگاہ بین الاقوامی سیاست پر تھی۔ اور دول مغرب للچائی ہوئی نظروں سے عسیر کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے تیور ان کی قلبی کدورت کی غمازی کر رہے تھے چنانچہ شیخ نے یہی مناسب سمجھا کہ عسیر کی عنان حکومت امیر علی ادریسی کی بجائے اس کے جہاں دیدہ چچا امیر حسن ادریسی کو سونپ دی جائے اور نجد و عسیر کے درمیان ایک معاہدہ کی داغ بیل ڈال کر یورپین اقوام کی دستبرد سے عسیر کو ہمیشہ کے لئے

محفوظ کر لیا جائے۔ چنانچہ شیخ نے یہ دونوں کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیئے اور رفتہ رفتہ اتنی طاقت فراہم کر لی کہ دول یورپ ان کا نام سنتے ہی تھرا اٹھتی تھیں۔ جنگ عظیم نے جس طرح بڑے بڑے سلاطین کے تاج ان کے سروں سے اتار پھینکے۔ اسی طرح صحرا کے اس درویش رہنما کو بھی اس کے سیاسی اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ مدتوں وہ جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے لیکن اس کے باوجود ان کی محبوب شخصیت اور ان کے اثر و رسوخ میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا چنانچہ بیتار ایک دور جلد ختم ہو گیا اس لئے کہ ان کی حکومت گوشت اور پوست پر نہیں تھی۔ بلکہ ان کا تسلط دلوں اور روحوں پر قائم تھا۔

شکل و شباہت

شیخ مرعوب کن صورت رکھتے تھے۔ ان کا جسم لاغر شکل مراکشی اور رنگ گورا تھا ناک بڑی اور خمیدہ۔ داڑھی ہلکی اور چھوٹی مونچھیں لمبی اور پتلی۔ لباس مراکشی اور قد میانہ تھا۔

عادات و خصائل

شیخ فطرتاً بہادر تھے۔ ان کی بات بات سے جرأت ٹپکتی تھی وہ جب تک زندہ رہے۔ شجاعت اور مردانگی سے دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کی زندگی کے آخری لمحات تک اطالوی فوجیں ساحل طرابلس سے آگے نہ بڑھ سکیں۔

نمایندہ اخبار کی باریابی

شیخ کی بے مثال شخصیت ان کے عزم صمیم اور ان کے ولولہ جہاد کی پرجوش داستانیں سارے یورپ میں حیرت سے سنی جا رہی تھیں۔ اخبارات کے نمائندے شیخ کے مقاصد سے باخبر ہونے کے لیے ان کی خدمت میں آنے لگے۔ ذیل میں ایک ملاقات کا حال درج کیا جا رہا ہے جس سے ان کی قوت ایمانی اور جرأت لسانی کا حال معلوم ہوتا ہے اخبار "طان" (فرانس) کے نمائندے نے شیخ سے عبیر کے قلعہ میں ملاقات کی۔ رات کا وقت تھا۔ دو غلام ان کے آگے آگے روشن موم بتیاں لئے چل رہے تھے اور پیچھے بارہ سپاہی ننگی تلواریں لئے ساتھ تھے۔ وہ صحن میں پہنچ کر ایک تنگ دروازے میں گھسے اور ایک دوسرے وسیع صحن میں پہنچے۔ وہ برابر ایک صحن سے دوسرے صحن میں پہنچتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک مکعب شکل کی مختصر

عمارت کے سامنے ٹھہر گئے یہی شیخ سے ملاقات کی جگہ تھی۔

تھوڑی دیر بعد شیخ سنوسی داخل ہوئے۔ شاہانہ جاہ و جلال اور روحانیت ان کے نورانی چہرے سے برس رہی تھی۔ پھر یکایک ان کے اعصاب میں ہیجان پیدا ہوا۔ اور ان کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ شیخ قالین پر بیٹھ گئے۔

"یہ بہت شریف آدمی ہیں ان کی بات پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔" وزیر نے اخباری نمائندے کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

شیخ کا اظہار خیال

شیخ نے جوش انگیز لہجہ میں تقریر شروع کی۔ اٹلی کا نام جب زبان پر آتا تھا تو دانت پیستے تھے "ہم سنوسی آزادی کے ساتھ رہیں گے اور آزادی مریں گے۔" شیخ نے پُر زور آواز میں کہا

"ہم موت کے آخری لمحے تک یورپین ملک گیری سے لڑیں گے۔ بہت ممکن ہے آج ہم فتح حاصل نہ کر سکیں لیکن سیاسیات میں ہمیشہ مواقع پیدا ہوتے رہتے ہیں عنقریب ہمارا موقع بھی آجائے گا۔"

آزادی کی قیمت

بعض سلطنتیں ہم سے کہتی ہیں "اپنی تلوار نیام میں رکھ لو۔" ہم تمہیں اس قدر دولت دیتے ہیں" یہ وہ سلطنتیں ہیں جو علم و حکمت کی دعویدار ہیں مگر عربی علم النفس سے مطلقاً جاہل ہیں۔ اگر وہ احد پہاڑ کے برابر بھی ہمیں سونا تول دیں اور افریقہ کی پوری ریگ کو الماس و زمرد بنا دیں۔ جب بھی ہمارا یہی جواب ہوگا نہیں! آزادی چاندی سونے اور لعل و جواہر سے بھی زیادہ قیمتی ہے وہ کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کی جا سکتی۔

سنوسی تحریک

یورپ میں شاید یہی سمجھا جاتا ہے کہ سنوسیت محض ایک بدوی درویشوں کا طریقہ ہے یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ ہماری ہر خانقاہ بیک وقت مسجد، مسافر خانہ، مدرسہ اور فوجی بارک ہے۔ ہر خانقاہ کا شیخ بیک وقت نماز کا امام، مدرسہ کا معلم، مجلس کا واعظ اور فوج کا سپہ سالار ہے۔ تمام صحرائے افریقہ ہماری خانقاہوں سے لبریز ہے تمام خانقاہیں صرف ایک مرکز کے تابع ہیں اور اس مرکز کا امام خود میں ہوں۔

"ہماری تحریک طرابلس، سوڈان، مصر، حجاز اور یمن تک پھیلی ہوئی ہے، ان تمام علاقوں میں اس نے سیاسی قوت اپنے ہاتھ میں نہیں لی لیکن جب ہم چاہیں بغیر جنگ کئے ان علاقوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔"

"اتنی طویل اور خونریز جنگوں کے بعد بھی اٹلی سمندر سے کچھ زیادہ دور تک نہیں جا سکا اندرون ملک پر ہمارا قبضہ ہے۔"

صحرائی جنت شیخ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "جغبوب سلطان عبدالحمید کا عطا کردہ ہمارا ایک مقدس شہر ہے صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہاں محمد سنوسیؒ کی قبر ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ وہ روحانی مرکز ہے۔ یہ ہماری سب سے بڑی علمی جامعہ (یونیورسٹی) ہے ہم نے اس صحرائی خطے کو جنت بنا دیا ہے۔ اس میں نہریں جاری کی ہیں۔"

اجنبی غلامی ہم سے اٹلی کہتا ہے "ہماری اطاعت قبول کرو۔" ہرگز نہیں! یہ ہمارا جواب ہے اور قیامت تک یہی جواب رہے گا۔ میں تمام سنوسیوں کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ اپنی گردنیں کٹوا دینا ہمارے لئے اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ اجنبی اطاعت قبول کریں۔

اسلامی روح شیخ سنوسی بڑے غصہ جوش اور تلخی سے تقریر کر رہے تھے۔ اچانک وہ چپ ہو گئے شاید سستانے لگے پھر انھوں نے مجھ سے کہا:۔

"جب تم واپس جاؤ۔ تو اٹلی والوں سے کہہ دینا کہ انہوں نے اب تک اسلامی روح کو نہیں سمجھا۔ اگر سمجھا ہوتا تو ہرگز یہ خیال نہ کرتے کہ وہ ہمیں زیر کر لیں گے۔ بہت سی سلطنتیں جو آج بڑی ہیں کل چھوٹی ہو جائیں گی جرمنی اور روس اس کی مثال ہیں لیکن کون جانتا ہے اس کا انجام کیا ہوگا؟ کیا اٹلی کے پاس کوئی ضمانت موجود ہے کہ اس کی قوت ہمیشہ برقرار رہے گی اور ہم کبھی کروٹ نہیں لیں گے میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔

غلامی یا سیاہ موت میں ہرگز اٹلی کی ملک گیر پالیسی کے آگے جھک نہیں سکتا یہ ناممکن ہے، بالکل ناممکن ہے! قیامت تک ناممکن ہے! ہیں

یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے خونریزی مرغوب ہے میں ہرگز جنگ کا خواہشمند نہیں ہوں میں صلح چاہتا ہوں اٹلی سے بھی صلح چاہتا ہوں مگر صلح کی بنیاد کیا ہو؟ غلامی! نہیں۔ ہرگز نہیں غلامی سے پہلے موت، سیاہ موت، پھر کیا ہو؟ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ جنگ! موت تک جنگ! قیامت تک جنگ!

اظہارِ غیظ و غضب اب شیخ سنوسی کا غصہ حد بیان سے تجاوز کر چکا تھا۔ وہ تمام بدن سے کانپ رہے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں میں نے آج تک کبھی کسی آدمی کو اتنے غیظ و غضب میں نہیں دیکھا میں ہرگز اپنی اس حالت کی پردہ پوشی نہیں کرنا چاہتا۔ کہ ان کا غصہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا وہ کہتے کہتے چپ ہو گئے۔

میں سمجھا اب غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہے مگر اچانک وہ پھر زور سے چلائے۔

جاؤ! اٹلی والوں سے کہہ دینا کہ آزادی یا موت!

وہ جوش سے بالکل بیخود تھے کچھ اور کہنا چاہتے تھے مگر ان کا جوش و غضب دیکھ کر میں نے یہی بات موزوں سمجھی کہ مجلس ختم ہو جائے۔ خلافِ دستور میں نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ شیخ بالکل خاموش ہو گئے مگر تمام بدن سے کانپ رہے تھے۔ انہوں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ شاید کہہ بھی نہ سکے۔ صرف ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہا۔

شریف مکہ اور شیخ سنوسی جنگ یورپ ۱۹۱۴ء کے آغاز میں جب برطانوی سیاست شریف حسین حجاز کے سابق والی پر اپنا اثر ڈال رہی تھی۔ شیخ سنوسی کی اسلامی حمیت نے اسے گوارا نہ کیا آپ نے شریف مکہ کو ترکی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے سے روکا لیکن شریف حسین پر انگریزی جادو چل چکا تھا اور وہ بابِ عالی سے رشتہ توڑ کر اس کے دشمنوں سے تعلق پیدا کر چکا تھا علامہ اقبال مرحوم نے ذیل کے شعر میں اسی واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے ؎

کیا خوب شریف مکہ کو پیغام دیا سنوسی نے
تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا

ریف کا شیر دل غازی عبدالکریم

غازی عبدالکریم مجاہد ریف دور حاضر کی ان جلیل القدر اور حیرت انگیز ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے استعمار فرنگ کی طوفانی موجوں کو روکنے اور اپنے عزیز وطن کو تہذیب و تمدن کے علمبرداروں کی دستبرد سے بچانے کے لئے اپنی اور اپنی قوم کی زندگیاں وقف کر دیں۔ اور اس راہ میں نہ ان کو اپنی بے سروسامانی کا غم ہوا۔ اور نہ دشمنوں کی کثرت و قوت کا خوف لاحق۔ ان کی زندگی میں ان تمام اقوام اور ان اقوام کے رہنماؤں کے لئے درس عبرت و بصیرت ہے۔ جو فرنگی یا غیر فرنگی اقوام کی قوت و کثرت سے ہراساں ہیں۔ درس یہ ہے کہ اس عالم اسباب میں قوت و کثرت حقیقی موثرات میں سے نہیں ہے۔ اور اگر جدوجہد کو صحیح اصولوں پر چلایا جائے تو قلت کثرت پر غالب آسکتی ہے۔ چنانچہ مجاہد ریف غازی عبدالکریم اور ان کے ساتھی جب تک جہاد حریت میں اخلاص و صدق۔ ایثار و فدویت اور اتحاد و تعاون سے کام لیتے رہے۔ اس وقت تک ہسپانیہ اور فرانس جیسی عظیم الشان سلطنتوں کا پورا فوجی ساز و سامان بھی ان کو شکست نہ دے سکا۔ لیکن جب دشمنوں کی ریشہ دوانیوں نے غازیان ریف کی ایمانی صفوں میں انتشار پیدا کر دیا۔ اور ان میں سے بعض کو اغراض کی قربانگاہ پر قربان ہونے کے لئے آمادہ کر لیا۔ تو پورا ریف مغلوب ہوگیا۔ گویا اصل شئے "ایمان" ہے۔ جب تک قائم ہے۔ قوم بھی قائم ہے۔ خواہ وہ تھوڑی ہو یا زیادہ اور اس کے پاس دنیوی ساز و سامان کافی ہو یا ناکافی۔ اور اگر ایمان قائم نہیں۔ تو قوم ریت کی دیوار ہے جس کو ہوا کے بگولے بھی منہدم کر سکتے ہیں۔

مراقش کی تاریخ

مراقش پر اسلامی پرچم اقبال کو بلند ہوئے بارہ سو سال سے زیادہ عرصہ ہوتا ہے۔ حضرت عقبہؓ نے سب سے پہلے مراقش پر ۸۲ھ میں خلافت اسلامیہ کا قبضہ و تسلط قائم کیا۔ یہ وہی مرد حق ہے جس نے اپنے عزم جہاد کی پہنائیوں کے سامنے خدا کی خشک زمین کو تنگ دیکھ کر بحر اوقیانوس میں اپنا گھوڑا ڈال دیا تھا۔ اور آسمان کی طرف نگاہ حسرت بلند کر کے کہا تھا کہ الہ العالمین اب تیری زمین ہی ختم ہوگئی ہے ورنہ تیرا یہ جاں نثار بندہ رہوار جہاد کی عنان تھامے ہوئے تھا۔

عقبہ کے بعد موسیٰ بن نصیر نے شمالی افریقہ پر اسلامی سیادت کو مستحکم کیا چنانچہ ۸۷ھ

میں اسلام کا مشہور سادہ بے پناہ فاتح طارق بن زیاد دس ہزار مصری لوگوں کو لے کر طنجہ پر قابض ہوا اور بعد میں اسی علاقے کے ۷ ہزار نومسلموں کو ساتھ لے کر ہسپانیہ پر چڑھ دوڑا اور یورپ میں سب سے پہلی اسلامی سلطنت کی بنا ڈالی۔ اب ہسپانیہ اور افریقہ کی قسمتیں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوگئیں لیکن پانچ سو سال کے بعد جب اندلس کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہوا اور اس کی داستان جتنی طویل ہے اس سے زیادہ غم انگیز ہے۔ تو فتوحات کے سیلاب کا رخ یکایک پلٹ گیا۔ اب مراقش جو مسلمان تھا ہسپانیہ اور فرانس کی ہوس استعمار کا شکار ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک حصہ ایک نے دبا لیا اور دوسرا دوسرے نے۔ اور اس میں خود مسلمان قبائل کی آپس کی مخالفت سب سے زیادہ ذمہ دار ہے ۱۸۵۸ء کا سال وہ آخری منحوس سال ہے جس میں مراقش پر غیر ملکی تسلط کے قیام کا آغاز ہوا ۱۸۵۹ء میں مولائے عبد الرحمن کا انتقال ہوا اور بدبخت مسلمان اس تاج و تخت کی دعویداری کے لئے آپس میں لڑنے لگے۔ جو فرانس و ہسپانیہ کی غلامی کا دوسرا نام تھا۔ اس لئے کہ گو مراقش کے "مولا" بظاہر مولائے حکومت تھے مگر اقتدار فرانس و ہسپانیہ کے ہاتھ ہی میں تھا۔ اس خانہ جنگی سے جو ۱۸۶۳ء میں ہو رہی تھی فرانس و ہسپانیہ کو بہانہ مل گیا کہ وہ اپنے قبضے کو زیادہ فوجی اور غیر ملکی مسیحی حقوق کو وسیع کریں۔ یہ سلسلہ ۱۸۹۴ء میں ختم ہوا۔

ریف میں تحریک کا آغاز

۱۹۰۰ء میں انقلاب زمانہ نے جب نااہل عبد العزیز کو سلطان مراقش بنایا۔ تو حالات نے اس قدر ناگفتہ بہ صورت اختیار کر لی۔ کہ خود اہل مراقش سلطان کی عیاشی، بے دینی، اسراف، لہو و لعب اور فرنگیت نوازی سے تنگ آ کر باغی ہوگئے۔ بغاوت کو فرو کرنے کے لئے فرانس و ہسپانیہ نے سودی قرضے دیئے اور بالآخر ملک پر قابض ہونے کا بہانہ پیدا کر لیا۔ اور یہی سے ریف کے حریت پسند قبائل کے جہاد آزادی کی بنیاد پڑی۔ جو اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے میدان میں نکل آئے۔ عدل و انصاف، جمہوریت و دستور اور عہد نامے سب ان کے طرفدار تھے لیکن یورپ کی اقوام نے ان باتوں کی پہلے کب پرواہ کی ہے جو اب کرتیں۔

قضیے کی ابتدا

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ کہ ابتدا میں انگلستان، جرمنی، فرانس اور ہسپانیہ نے مل کر ایک کمپنی قائم کی جس کا نام "کمپنی معدنیات مراقش" تھا۔ اس نے مولائے حفیظ کو گانٹھا۔ جو مولائے عبد العزیز کے مقابلے میں مدعی سلطنت

تھا اور اسی سے اجارہ حاصل کیا۔ اور اس اجارے کے پردے میں ۱۹۰۵ء میں ہسپانیہ نے ریف پر قبضہ کر لینے کی ٹھانی اور فوج کشی کر کے اس کے شمالی حصے پر قبضہ کر لیا۔ باشندگانِ ریف زخمی شیروں کی طرح بپھر کر گھروں سے نکلے اور جہادِ حریت میں سربکف ہو گئے۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ مولائے مغرب یعنی سلطان مراکش کو ریف پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اس کے بعد اہل ریف میں ۱۹۰۹ء میں ریفی مزدوروں اور کاریگروں نے ریلوے لائن پر کام کرنا چھوڑ دیا۔ اور بعد میں ان کے قلعے پر حملہ کر دیا۔ ہسپانیہ کا تین ہزار کا لشکر سرکوبی کے لیے نکلا لیکن ریفیوں نے ۳۰ آدمیوں کی جمعیت سے شبخون مارا اور جنگ کے طبل پر چوٹ پڑ گئی اور خونیں معرکے شروع ہو گئے۔ ان معرکوں میں ریفیوں نے اپنی ذہانت، قدر اندازی اور بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ پے در پے ہسپانوی جرنیل تبدیل اور ہزاروں ہسپانوی سپاہی ہلاک ہوئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۲ء تک جاری رہا اور ہسپانیہ کی ساری فوجی قوت بھی اہل ریف کو مغلوب نہ کر سکی۔

مردِ غیب کا ظہور

یہاں سے جہادِ ریف ایک محیر العقول کروٹ بدلتا ہے۔ اور ایک مردِ غیب ان گوشوں میں سے نمودار ہوتا ہے۔ جن پر گمان بھی نہیں تھا۔ کہ ان میں کوئی شیر مخفی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ملیلہ کے حاکم نے ریفی عربوں کی ایک کانفرنس منعقد کی اور اس میں تمام شیوخ قبائل کو دعوتِ شرکت دی۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا۔ کہ جہاں ہسپانیہ کی توپ و تفنگ کامیاب نہیں ہو سکی، وہاں قبائل کی غداری سے کام لیا جائے۔ ان شیوخ میں ایک نوجوان سردار محمد بن عبدالکریم[1] بھی تھا۔ جو ہسپانیہ کے صیغۂ ملکی میں ایک ممتاز افسر تھا۔ اور سرحدِ ریف پر فرانس کی سازشوں کا کامیاب مقابلہ کر چکا تھا۔ اس کا اور ہسپانیہ کا تعلق اوائل عمر سے تھا۔ اس کے والد ہسپانوی حکومت کے معتمد علیہ دوست تھے۔ خود محمد بن عبدالکریم میڈرڈ یونیورسٹی سے انجینیری اور قانون کی اعلیٰ ڈگری لے چکے تھے۔ اور ان دنوں ریف میں ہسپانیہ کے نائب معتمد کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ملیلہ کی کانفرنس میں ہسپانوی گورنر نے محمد بن عبدالکریم سے بھی فرمائش کی۔ کہ وہ قبائل ریف کو مطیع ہو جانے کا مشورہ دیں۔ محمد بن عبدالکریم نے حیران ہو کر کہا۔ کہ ہسپانیہ کو کس معاہدے کی رو سے ریف پر قبضہ کرنے کا حق ہے۔ یہ جواب سن کر گورنر تو خاموش ہو گیا۔ لیکن ایک دوسرا شخص جنرل سلوسٹر جو اپنی مغلوب الغضبی اور بدزبانی میں مشہور تھا برہم ہو گیا۔ اور باتوں ہی باتوں میں اس نے محمد بن عبدالکریم کی کنپٹی پر گھونسہ رسید کر دیا۔

[1] آپ ملیلہ کے مشہور قبیلہ اوریاغل کے سردار ہیں۔

اس ایک واقعے نے پوری صورت حال کا نقشہ بدل دیا۔ محمد بن عبد الکریم اپنے ہمراہی شیوخ کو لے کر کانفرنس سے نکل آئے اور اعلان کر دیا کہ قائدان ریف کو کسی کانفرنس میں شامل ہونے کی تکلیف نہ دی جائے۔ ریف کی قسمت کا فیصلہ ہسپانیہ نہیں کر سکتا بلکہ اس کا فیصلہ خود اہل ریف کے ہاتھ میں ہے۔ اس غرض کے لئے شیوخ ریف کی ایک کانگرس منعقد کی گئی جس میں قرآن مجید پر آزادی وطن کا حلف لیا گیا۔ اس اجتماع شیوخ کا نام "جمعیت اسلامیہ محمدیہ" قرار پایا اور قومی فیصلے سے تمام قبائل کو اطلاع دینے کا اہتمام ہوا۔ اس کے بعد آغادیر اور شیشوان میں کانفرنسیں ہوئیں اور تمام ریف میں جہاد حریت کا غلغلہ بلند ہو گیا۔ قبائل نے سب سے پہلے دو غدار قبائل کی خبر لی جنہوں نے رشوت لے کر غیر ملکی کمپنی کار ہولوس کو کوئلہ نکالنے کی اجازت دی تھی۔ اور ان کو دیہات سے نکال دیا۔

قائدین ریف کا منشور عام

قائدین ریف نے اس زمانے میں ایک منشور عام شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ ریف ریفیوں کا ہے وہی اس کی حکومت کے مالک ہیں اور ہسپانوی حکام کو کوئی حق نہیں کہ اپنے ملک کی اصلاح سے غافل ہو کر قبائل ریف کی اصلاح و ترقی کی طرف مائل ہوں۔ لہذا ریف کے ہسپانوی افسروں کو "جمعیت اسلامیہ محمدیہ" کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ریف سے فی الفور رخصت ہو جائیں۔ اور ہمیں اپنی قومی حکومت مرتب کرنے کا موقعہ دیں۔ اس معقول اور دستوری تحریر کا جواب ہسپانوی افواج کی یورش سے دیا گیا۔ ۲۵ ہزار کا لشکر وادی القبیبہ پر حملہ آور ہوا۔ ریفیوں نے اس وقت پوری ذہانت سے کام لیا۔ ہسپانوی لشکر کو آگے بڑھنے دیا اور جب وہ کوہستان کی وادیوں میں پھنس گیا تو اس طرح گھیر کر روندڈالا گویا بکریاں تھیں۔ جو شیروں کے ہتھے چڑھ گئی تھیں۔ ۲۵ ہزار میں سے دس ہزار مارے گئے ۸ ہزار قید ہو گئے اور یہ تمام ماجرا ۸ گھنٹے میں ہوا۔ خود جنرل سلوسٹر بھی ہلاک ہوا۔ اس واقعہ سے ہسپانیہ میں ایک کہرام مچ گیا اور مجاہدین کے حوصلے اتنے بڑھے کہ انہوں نے تھوڑے ہی عرصے کی متواتر تگ و تاز سے ہسپانویوں کو ملیلہ تک دھکیل دیا۔ جنگی جہاز دل پر شبخون مارے۔ اور اس سارے علاقے کو اجنبی اقتدار سے چھین لیا۔ انتہا یہ ہے کہ ساحل سے ۵ میل تک قومی حکومت کی حدیں پھیل گئیں۔ ہسپانوی توپوں سے جو ہسپانیہ والوں سے مال غنیمت میں ملی تھیں۔ حاکم ملیلہ کی پناہ گاہ الفانسو جنگی جہاز پر گولے پھینکے گئے اب ہسپانیہ کا اقتدار ختم ہو رہا تھا۔

جمہوریت ریف کا قیام

ان واقعات کی اطلاع کے اخفا کے باوجود ہسپانیہ کے عوام تک پہنچ گئی۔ کچھ ان انگریزوں نے پہنچائیں، جو ریفیوں کی سرکوبی کے مقدس کام کی سر انجام دہی کے لئے ہسپانوی فوجوں میں رضا کاروں کے طور پر شامل تھے اور جن کو موت کے منہ میں سب سے آگے دھکیلا جاتا تھا جن سے خطیر تنخواہ کا وعدہ مگر جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا اور جو خراب و خستہ ہو کر اور فوج سے نام کٹوا کر واپس انگلستان پہنچے تھے اور کچھ انگریزی اخباروں نے ان واقعات کی اشاعت پر ہسپانیہ میں تہلکہ مچ گیا۔ مارکوئیس کاوکنتی سپہ سالار افواج ہسپانیہ معزول کر دیا گیا۔ یہ تمام واقعات ۱۹۲۱ء کے اواخر سے لے کر ۱۹۲۲ء کے اوائل تک چند ماہ میں پیش آئے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مجاہدین ریف کی اہلیت جہاد اور ہسپانیہ کی قوت تسخیر میں کتنا فرق تھا۔

اب عملاً ریف کا علاقہ آزاد تھا اور وقت آ گیا تھا۔ کہ دوسرا اور زیادہ صحیح قدم اٹھایا جائے۔ یعنی ریف کے جہاد حریت کو دستوری و تنظیمی صورت دے دی جائے۔ محمد بن عبدالکریم کی دقیقہ رس نگاہ اس سے بھی غافل نہ تھی۔ انہوں نے فتح قرط کے بعد قبائل ریف کی ایک عمومی کانفرنس منعقد کی جس نے جمعیت اسلامیہ محمدیہ کو باقاعدہ حکومت میں تبدیل کر کے اس کا نام جمہوریہ اسلامیہ ریف رکھا۔ محمد بن عبدالکریم اس کے پہلے امیر قرار پائے۔ ایک مجلس انتظامی مرتب ہوئی جس کا فرض تھا کہ علاقہ ریف کا نظم و نسق چلائے۔ مشیوخ قبائل کی کونسلیں بنا دی گئیں۔ اور قائد علاقہ ان کا افسر مقرر کیا گیا۔ ایک بیت المال بھی قائم ہوا۔ تجارت، مالیہ کی وصولی اور دوسرے رفاہ عامہ کے وسائل اختیار کئے گئے۔ اور ریف کا قبائلی علاقہ ایک مستقل جمہوریت کی صورت اختیار کر گیا۔

فرانس کا دخل در معقولات

اس صورت حال پر ایک سال گذرا۔ ۱۹۲۳ء کے اوائل میں پھر ہسپانیہ نے ایک جدید جنگ کی تیاری کی۔ انگلستان سے اس مقدس مقصد کے لئے گولہ بارود اور فولادی ٹینک خریدے۔ ۱۲ مارچ کو مقام بنی سعد میں ایک ہولناک جنگ ہوئی جس میں سامان جنگ کی فراوانی اور افواج کی کثرت بھی ہسپانیہ کے کام نہ آئی۔ اور جہاد و شہادت کے سرفروش ہنگامے نے توپوں کو سرد ٹینکوں کو بے کار اور فوجوں کو منتشر کر دیا۔ اسی زمانے میں غدار ریسونی کا فتنہ برپا ہوا جس نے ہسپانیہ کے سامنے اپنی گورنری، انعام و اکرام اور تنخواہ و معاوضہ کا مطالبہ پیش کیا۔ اور بالآخر

مجاہدین ریف کے ہاتھوں پڑ کر اور قید ہو کر چند ہفتے کی اسیری کے بعد خدا کے یہاں پہنچ گیا۔

مراقش کے متعلق انگلستان فرانس اور ہسپانیہ کے مابین جو خفیہ معاہدے ہو چکے تھے ان کی رو سے ایک حصے پر فرانس کا قبضہ تسلیم کیا گیا تھا اور ریف پر ہسپانیہ کا۔ جب ہسپانیہ تسخیر ریف سے عاجز آگیا تو مغربی استعمار کی رگ حمیت میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اس سے قبل انگلستان اور فرانس خفیہ طور پر ہسپانیہ کی اعانت کرتے رہے تھے۔ اب فرانس علانیہ میدان میں اتر آیا۔ کہ بادۂ جمہوریت کے اس رندِ لم یزل کو ریفیوں کی آزادی و جمہوریت میں ان کی تباہی نظر آرہی تھی چنانچہ فرانسیسی اخبارات نے امیر عبدالکریم کی ظفرمندیوں کو قبائل ریف کے مفاد کے منافی قرار دیا اور عمایانِ فرانس کو مشورہ دیا کہ ریف و مراقش کو غازیان ریف کی دستبرد سے بچایا جائے۔ اس مشورے کی تعمیل میں سرحدی چوکیوں کو مستحکم کیا گیا جس سے مشتعل ہو کر سرحدی قبائل نے چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کو امیر عبدالکریم کے اشارے پر مبنی قرار دیا گیا اور بغیر گفت و شنید کے مارشل لیوتی نے ریف پر حملے کی تیاری کر دی۔ اس کی روک تھام کے لیے جون ۱۹۲۵ء میں د ہزار ریفیوں کا ایک لشکر جمع ہو گیا۔ اور انہوں نے مراقش و ریف کی تجارتی شاہراہ کو بند کر دیا۔

فرانس کی ان حرکتوں سے ریف ہی میں آگ نہیں لگی۔ بلکہ فرانسیسی مراقش کے قبائل بھی بھڑک اٹھے۔ اور انہوں نے فرنچ حکام کا قافیہ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ مارشل لیوتی یہ حالات دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے وزان کی چھاؤنی خالی کر دی۔ اور فرنچ سپاہ کو مغربی حدود کی طرف پہنچا دیا۔ جب یہ خبریں فرانس پہنچیں تو موسیو پینلیو وزیر نو آبادیات فرانس نے خود ریف کا سفر اختیار کیا اور واپس جا کر بتایا کہ ریف پر زبردست حملے اور یورش کی ضرورت ہے اور اس کے لئے زبردست جنگی تیاری کی حاجت۔ چنانچہ ہسپانیہ تو پٹ کر پیچھے ہٹ گیا اور فرانس نے اس کی جگہ لے لی اور استعمار مغرب اپنی بھیانک صورت میں بے نقاب ہو کر سامنے آگیا۔ فرانس سے نہایت جرار لشکر ریف کی سرحدوں پر پہنچا دیئے گئے۔ اور اس کے ساتھ اندرونی سازشوں اور رشوتوں کا بازار گرم کر دیا گیا۔ اس غرض کے لئے جو کامیاب ترین حربہ اختیار کیا گیا وہ اعلان تھا کہ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ مراقش کے حصے بخرے نہ ہوں اور ریفی سلطان مراقش کی سیادت قبول کر کے "وحدت ملی" کی زندگی بسر کریں۔ امیر عبدالکریم کے سامنے فرانسیسی وزارت نے ایک عہدنامہ بھی مرتب کر کے پیش کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ ریف کی آزادی کا دعویٰ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ ریف پر سلطان مراقش کی سیادت تسلیم

کر لی جائے۔ امیر عبد الکریم کی نگاہ اس فریب سے واقف تھی۔ انہوں نے اس کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اور فرانس و ریف کے مابین باقاعدہ جنگ چھڑ گئی جس میں ریفیوں نے جہاد و غزا کے وہ وہ کارنامے سرانجام دیئے کہ دوست تو دوست دشمن بھی احسنت پکار اٹھے۔ انہوں نے فرانس کے دمدمے ہوا کر دیئے اور چھاؤنیاں تباہ کر دیں۔ پہاڑوں میں فرانسیسی فوجوں کو سرگرداں کر کے مار ڈالا اور کئی مرتبہ دشمنوں کو عبرتناک شکستیں دیں اور دنیا کو اندازہ ہو گیا کہ ایک محب وطن قوم کو محض قوت کے زور سے نہیں دبایا جا سکتا۔

مکر و فریب کا جال

لیکن افسوس کہ مکر و فریب کا جال جو بچھایا گیا تھا۔ وہ اپنے حلقے کسنے لگا۔ ریفی شیوخ میں سے بعض افراد جو جہاد حریت میں تھک گئے تھے۔ فرانس کے عہد نامے کی زہریلی دفعات سے متاثر ہونے لگے۔ ان کے دل میں یہ فریب گھر کرنے لگا کہ آخر اس معاہدے میں کیا خرابی ہے۔ ہماری آزادی تسلیم کی جا رہی ہے۔ صرف سیادت سلطان کا مطالبہ ہے۔ اور یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ "وحدت ملی" کا تقاضا یہی ہے۔ بعض نے خیال کیا کہ فرانس تعمیر و ترقی کے وعدے کر رہا ہے۔ ان پر اعتبار نہ کرنا نادانی ہے۔ حالانکہ ہسپانیہ کی صدیوں کی حکومت کے بعد بھی ریفی بالکل "غیر متمدن" ہی رہے تھے۔ بلکہ ریفی مجاہدین کے اعلان کے مطابق ملیلہ۔ سبطہ۔ تطوان۔ سیوطہ اور الحسیمہ جیسے ساحلی شہروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ نہ صفائی۔ نہ تعلیم۔ نہ انتظام۔ آبادیاں غلیظ باشندوں میں بے حیائی عام فحش خانے قائم اور بستیاں یورپی اوباشی کا نمونہ تھیں۔ اس کے بالمقابل عربی قبائل کی بستیاں بدرجہا بہتر تھیں۔ صاف اور سلیقہ مند اور باشندوں کے اخلاق بلند اور پاکیزہ تھے۔

یہ روشن حقیقتیں تھیں لیکن استعمار کا جادو کھلتی ہوئی طبیعتوں اور زہر آلود دلوں پر چل گیا اور پہلے ریفی مجاہدین کے شیوخ میں انتشار پیدا ہوا اور اس کے بعد غیر ملکی فتوحات کا سلسلہ در زہوا۔ سامان حرب کی کمی کا علاج ہو سکتا تھا لیکن دلوں کی خستگی کا کیا مداوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی مہم کامیاب ثابت ہوئی۔ امیر عبد الکریم کے اکثر ساتھی شہید اور گرفتار ہو گئے اور بالآخر ۱۹۲۶ء میں یہ مرد مجاہد بھی میدان جنگ میں داد شجاعت دیتا ہوا اسیر ہو گیا۔ فرانسیسی حکومت نے اس نامور بہادر کو جہاز میں سوار کر کے مدغاسکر میں پہنچا دیا۔ جہاں امیر موصوف بظاہر سکون مگر بباطن شورش و اضطراب کی زندگی

بسر کر رہے ہیں۔
غازیٔ ریف قید میں ہیں۔ مگر ان کی روح اب بھی آزاد ہے۔ حکومت فرانس نے کئی مرتبہ امیر محبوس کے سامنے رہائی کی شرطیں پیش کیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ فرانس کی سیادت میں ریف کے گورنر بن جائیں لیکن انہوں نے اسیری کو رضاکارانہ اطاعت پر ترجیح دی :

؎ شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اَے امیر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مجتہد فکر و نظر علامہ جمال الدین افغانی

آج سے ٹھیک ایک سو سال پیشتر یعنی ۱۸۳۹ء مطابق ۱۲۵۴ھ میں سید جمال الدین افغانی جن کے نظریہ اتحاد اسلامی نے آج تمام اقصائے عالم میں دھوم مچا رکھی ہے۔ اس عالم آب و گل میں تشریف لائے تھے مقام ولادت سعد آباد ہے اور مقام وفات قسطنطنیہ۔ اور اسی ایک واقعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اجتہاد و جہاد کے اس عقاب بلند پرواز کے پروں میں اللہ تعالیٰ نے کتنی عظیم الشان صلاحیتیں ودیعت فرما رکھی تھیں، ساٹھ سال کی پرشور اور بے قرار زندگی عالم اسلام اور ممالک فرنگ کی سیاحت اور اقامت میں بسر کر دی۔ ایک ہی لگن تھی۔ جو اس سیماب صفت مسلمان مفکر کو دنیا میں بے چین رکھتی۔ یہاں تک کہ استبداد و جبر کی قوتوں نے مکر و فریب سے زہر دے کر شہید کر دیا۔ ان کی زندگی ختم ہو گئی لیکن ان کی تعلیمات کی روح اس طرح فضا میں منتشر ہوئی کہ ہر قریہ و دیہہ سے جمال الدین افغانی کی صدائیں بلند ہوئیں۔ ان کے ستانے والوں کے نام لیوا بھی آج موجود نہیں اور ان کا نام نیکی کے ساتھ لینے والا بھی کوئی نہیں۔ لیکن مسافر جمال الدین اور بیکسی میں شہید ہونے والے جمال الدین کے سامنے سر عقیدت خم کرنے والی آج ساری دنیا ہے۔ اقوام و سلاطین اس کو خراج تحسین ادا کرتے ہیں۔ اس کی صد سالہ برسی منانے کے لئے تمام عالم اسلام بے قرار ہو جاتا ہے۔

ابتدائی حالات

سید جمال الدین کے والد محترم کا نام سید صفدر تھا سلسلۂ نسب امام ترمذیؒ کے واسطے سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ سعد آباد میں ان کے والد ایک ممتاز اور صاحب ثروت امیر خاندان کی حیثیت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی آزاد منشی اور حریت فکر و رائے اتنی مشہور تھی۔ کہ امیر دوست محمد خاں مرحوم ان سے بدگمان ہو گیا اور ان کو کابل میں طلب کر لیا۔ اور ان کی زندگی سرکاری نگرانی میں بسر ہونے لگی۔ اس زمانے میں جمال الدین کم سن بچے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی اور مذہبی علوم کی تکمیل عمل میں آئی جس خاندان کی بنیاد ہی حریت فکر و آزادی

رائے پر قائم ہوئی ہو۔ اس کا یہ ذہین ہونہار اور بے قرار نوجوان چشم و چراغ کابل کے مجبور ماحول میں زندہ گھٹ کر رہ سکتا تھا۔ سیر و سیاحت اور علوم جدیدہ کی تحصیل کے سودائے پختہ کار نے نوجوان جمال الدین کو گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پہلے ہندوستان آئے ایک مدت یہاں قیام کیا لیکن ان کے حقیقی جوہر ابھی نہیں کھلے تھے۔ اس لئے قیام ہند کے زمانے کا حال بہت کم معلوم ہو سکا۔ اتنا معلوم ہے کہ یہاں کے اکابر علماء سے انہوں نے تحصیل علوم کی۔ اور ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو حضرت اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلفائے تبلیغ و جہاد تھے۔ ہندوستان کے قیام میں ان پر عالم اسلام کے حالات کا درد انگیز مرقع منکشف ہوا۔ نیز اصلاح ملت کے ایک ارشن دماغ تخیل نے ان کے قلب و ذہن پر غلبہ حاصل کیا۔ علوم جدیدہ سے بہرہ مند ہونے کے بعد حج و زیارت کا شوق دامنگیر ہوا۔ اور انہیں کشاں کشاں ارضِ حرم میں لے گیا۔ یہاں سے بلاد اسلامیہ کی سیاحت کی طرف متوجہ ہوئے اور عالم اسلام کا مشاہدہ کرتے ہوئے واپس افغانستان پہنچ گئے۔

سلطنت کابل کی وزارت

اس وقت امیر دوست محمد خاں سربراہ حکومت تھے اور افغانستان میں حیات جدیدہ رونما ہو رہی تھی۔ امیر کو ایک ایسے مشیر اور مدبر کی ضرورت تھی جو علوم جدید و قدیم کا عالم سیاست حاضرہ سے واقف اور ضروریات ملکی سے آشنا ہو۔ یہ صفات جملہ طور پر صرف جمال الدین میں تھے۔ اور امیر کی نظر انتخاب انہیں پر پڑی۔ سید موصوف راہ کی مشکلات سے واقف تھے ایک مطلق العنان امارت۔ ایک بے علم و قدامت پسند قوم اور خطرناک ہمسائے' یہ تین اہم پہلو تھے جن کو مدنظر رکھنا ضروری تھا۔ سید جمال الدین نے انتہائی پس و پیش کے بعد مشیر سلطنت کا عہدہ قبول کر لیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا جو خواب انہوں نے صرف نظری رنگ میں دیکھا ہے عملی طور پر اس کی ابتدا افغانستان سے ہو سکے گی۔ ان کو دو حیثیتیں حاصل تھیں۔ مشیر امیر اور افواج افغانستان کے مختار اعلیٰ۔

سید موصوف نے سب سے پہلے فوج کی تنظیم اختیار کی اور اس کو مغربی اصول و ضوابط کے مطابق تیار کرنے لگے لیکن ابھی ان کے ارادے عمل کی صورت اختیار نہیں کرنے پائے تھے

کہ ان کے قدردان امیر کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کے دو بیٹوں میں تخت و تاج کیلئے خانہ جنگی ہونے لگی۔ امیر شیر علی کابل پر قابض تھا اور امیر محمد اعظم خاں جلال آباد میں متمکن۔ محمد اعظم خاں نے کابل پر یورش کی۔ سید جمال الدین افغانی کی نگاہ بصیرت میں محمد اعظم خاں افغانستان کے مستقبل کے لئے زیادہ موزوں تھے اور ان کی ہمدردیاں انہی کے ساتھ تھیں لیکن تقدیر کا فیصلہ یہ ہوا کہ شیر علی غالب آیا اور سید جمال الدین نہ صرف اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ بلکہ افغانستان ہی کو خیرباد کہہ دینے پر مجبور ہوئے۔

مصر و قسطنطنیہ میں

سید موصوف نے دوبارہ قدم گھر سے نکالا۔ اس وقت اسلامی دنیا میں مصر کو حیات جدید کا مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ جہاں عرب اور ترک کے تخیل اور تمدن کا امتزاج ایک نیا شعور پیدا کر رہا تھا۔ سید موصوف ہندوستان ہوتے ہوئے ۱۸۷۰ء میں سیدھے مصر تشریف لے گئے۔ مصر میں اس یگانۂ عصر کے لئے آنکھیں بچھا دی گئیں۔ علمائے مصر سید کے علم و فضل سے مرعوب اور طلبہ متاثر تھے۔ ارباب سیاست بھی ان کے سیاسی تبحر سے مستفید ہوتے رہے۔ سید نے اپنے اسلامی نظریات کا تخم مصر کی زمین میں بو دیا لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ مصر سے زیادہ ترکی اس امر کے لئے موزوں ہے کہ نشاۃ اسلام اور اتحاد ملت کی تحریک کے آغاز کا مرکزی نقطہ قرار دیا جائے۔ مصر بہرحال محکوم تھا اور ترکی آزاد اور عثمانی سلطنت و خلافت عالم اسلام میں محبوب۔ لہٰذا سید قسطنطنیہ تشریف لے گئے۔ جہاں سلطان عبدالحمید ثانی نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ان کے علم و فضل، بلند نظری، جوش دینی اور ولولہ اسلامی نے بہت جلد ایک وسیع حلقہ اثر پیدا کر لیا۔ انجمن اتحاد و ترقی کے نوجوان ارکان خصوصیت کے ساتھ سید سے متاثر ہوئے لیکن یہی بات قیام قسطنطنیہ میں مانع ہوگئی۔ شیخ الاسلام نے سلطان کو یہ کہہ کر بدظن کر دیا کہ سید اتحاد و ترقی کی تحریک میں شامل ہیں چنانچہ علامہ ممدوح ترکی سے بھی رخصت ہو گئے اور دوبارہ مصر آ گئے۔ اس وقت اسمٰعیل پاشا خدیو مصر میں برسر حکومت تھے اور ریاض پاشا صاحب علم اور اہل کمال کے قدرشناس امیر تھے جن کو خدیو کے مزاج میں خاصہ دخل تھا۔ ان کی وساطت سے سید جمال الدین افغانی خدیو مصر تک پہنچے، اور ان کا وظیفہ مقرر ہو گیا اور سید موصوف اپنی تحریک اتحاد اسلامی کی تبلیغ و اشاعت

میں مصروف ہو گئے۔ اسی زمانے میں مصر کے ممتاز اہل علم نے سید صاحب سے شرف تلمذ حاصل کیا جن میں سے شیخ محمد عبدہٗ مصری سر آمد روزگار ہوئے۔ جامعہ ازہر کے اساتذہ اور طلبہ بھی مستفیض ہوتے تھے لیکن یکایک انگریزی حکومت کا تازیانہ استبداد حرکت میں آیا۔ اس نے حکومت مصر کو حکم دیا کہ ایسے خطرناک شخص کو مصر سے خارج کر دیا جائے جس کی تحریک سے عالم اسلام میں بے چینی، زندگی اور حرارت پیدا ہو رہی ہے۔ سید جمال الدین مصر سے نکل کر ہندوستان چلے آئے اور دکن کی علم نواز اور کمال شناس حکومت کی سرپرستی میں اپنی علمی اور فکری زندگی بسر کرنے لگے لیکن حکومت ہند نے یہاں بھی ان کی نقل و حرکت پر پابندیاں عاید کر دیں اور ان کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنے لگی۔

پیرس میں صحافتی زندگی

سید جمال الدین کی زندگی کے نظریے اب معین صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ انگریزی استعمار ان کی تحریک اتحاد اسلامی کو خطرے کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ انگریزوں کے محکوم علاقے سخت مجبور و معذور ہیں۔ لہٰذا وہ ہندوستان سے نکل کر پیرس چلے گئے۔ ان کے دو مخصوص ارادت کیش مفتی عبدہٗ اور عبدالعزیز نشاویش بھی وہیں پہنچ گئے اور سید صاحب نے ایک عربی اخبار "عروۃ الوثقیٰ" کے نام سے جاری کیا جس کا مقصد استعمار مغرب کی مخالفت کرنا اور ملت اسلامیہ کو اس سے آگاہ کرنا تھا۔ اسی زمانے میں سید صاحب نے امریکہ، روس اور جرمنی کا سفر بھی کیا۔ "عروۃ الوثقیٰ" نے نہ صرف عربی دنیا میں ہلچل پیدا کر دی بلکہ سرزمین عجم بھی اس کی صدائے حق سے گونج اٹھی۔ یہاں تک کہ شاہ ایران نے سید جمال الدین کو ایران تشریف لانے کی دعوت دی۔ پیرس میں تین سال قیام کرنے کے بعد سید صاحب ایران چلے آئے۔ ان کو گمان ہوا کہ اس سرزمین سے وہ اپنی تحریک کے آفتاب کو طلوع کر سکیں گے۔ شاہ ایران نے سید صاحب سے فرمائش کی کہ ایران کے لیے اصلاح و ترقی کا سیاسی اور مذہبی ضابطہ ترتیب دیں۔ سید صاحب نے اس کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا لیکن قدامت پسند امرا اور خود غرض اور تنگ نظر مجتہدین برافروختہ ہو گئے اور سید صاحب کو ایران سے بھی بصد حسرت و یاس رخت سفر باندھنا پڑا۔

ایران کی اس بے رخی نے سید صاحب کو سخت دل برداشتہ کیا لیکن وہ پھر بھی ہمت نہ ہارے اور لندن چلے گئے۔ یہاں رستم پاشا سفیر ترکی سے ملاقات ہوئی جس نے سلطان عبدالحمید کو سید کے کمالات کی طرف توجہ دلائی اور سلطان نے دوبارہ انہیں دارالخلافت میں آنے کی دعوت دی۔ سید موصوف پھر امید و آرزو کی ایک دنیا دل میں لئے ہوئے قسطنطنیہ پہنچے۔ سلطان نے ان کا نہایت شاندار استقبال کیا اور بڑی محبت و شفقت سے رکھا لیکن اب پیام اجل بھی آ پہنچا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد آپ نے مرض سرطان میں مبتلا ہو کر انتقال کیا اور انیسویں صدی کا یہ سب سے بڑا مسلمان مفکر اس دنیا سے اٹھ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ گمان کیا جاتا ہے کہ ان کو زہر دیا گیا تھا۔

سید مرحوم کے خصائص

سید جمال الدین افغانی مرحوم کی بیقرار اور مجاہدانہ زندگی کا یہ سرسری مرقع ہے لیکن اس مرقع میں جو حقیقت پوشیدہ ہے، وہ محض اتنے سے تذکرے میں بیان نہیں ہو سکتی۔ کہ سید موصوف نے کس طرح افغانستان کی سرزمین سے اٹھ کر ہندوستان، مصر، ایران، پیرس، لندن، اور قسطنطنیہ کی سیاحت کی اور بالآخر جان شیریں جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اصل یہ ہے کہ اس سیر و سیاحت اور جہاد و شہادت کی زندگی کو یہ تمام مراحل طے کرنے میں تیس سال صرف ہوتے۔ اور یہ امر سید مرحوم کی عظمت اسلامی و شخصی کے لئے بس کرتا ہے۔ کہ وہ جس مشن اور مقصد کو لے کر اٹھے تھے، اس کی تبلیغ و اشاعت میں ساری زندگی بسر کر دی۔ ان کے شخصی کمالات کا ہر شخص معترف تھا۔ بڑے بڑے سلاطین ان کو اپنی مصاحبت میں رکھنا فخر سمجھتے تھے۔ بڑے بڑے علماء ان کے تلمذ کو زندگی کا شرف اکبر تسلیم کرتے تھے۔ اور ہر قوم ان کی عزت و احترام کے لئے بیتاب تھی۔ لیکن سید مرحوم کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی۔ کہ ان کی دعوت حق وقت کی استعماری طاقتوں اور زمانے کے مسلمان سلاطین کے ذاتی مصالح کے لئے سازگار نہیں تھی۔ سید موصوف کی دعوت یہ تھی۔ کہ اسلام ایک مقصد جلیل لے کر دنیا میں آیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ ساری دنیا اس کے نظام اصلاح و ترقی کو قبول کرلے اسلام محض چند مذہبی رسوم کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو فرد سے

سے لے کر قوم تک اور قوم سے لے کر ساری دنیا کی زندگی کو معین کرتا ہے۔ اسلام کے مقاصد کی تکمیل کے لئے ملت اسلامیہ مامور ہے۔ قرن اول میں اس نے اس مقصد کو پورا کیا لیکن اٹھارھویں صدی سے اس کا سیاسی نفوذ رو بہ زوال ہو گیا۔ اور مغربی استعمار نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے بعض کو محکوم بنا لیا اور باقی کو ایک دوسرے سے منقطع کر دیا۔ اس زوال اور انحطاط کو اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ تمام عالم اسلام ایک جسد واحد کی طرح ہو جائے اور قوم و نسل اور زبان و رنگ کے اختلافات ختم کر دیئے جائیں۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ جو عین اسلام تھا استعمار مغرب اور جابر سلاطین کو پسند نہیں ہو سکتا تھا علی الخصوص جب اس میں نہ صرف مساوات اقوام کا کامل تصور تھا بلکہ انفرادی حیثیت سے بھی ہر مسلمان کو دعوت تھی۔ کہ وہ عملی طور پر تعلیمات اسلام کا پیکر ہو۔ خود سید مرحوم عقاید اسلام میں نہایت پختہ اور اعمال و عبادات کے سختی کے ساتھ پابند تھے۔ اور اتباع شریعت ہی کو اسلام کی حیات نو کا ضامن قرار دیتے تھے۔

عادات و خصائل

ان کا رنگ گندم گوں جسم مضبوط چشم و ابرو سیاہ۔ آنکھیں روشن حلقہ دار بال مختصر ڈاڑھی اور چھوٹی سی گول عربی پگڑی جو ابر رنگ رہتی تھی۔ انہوں نے دین اور ادب و فلسفہ کی تعلیم مسجد گذری شور بازار کابل میں حاصل کی۔ ریاضی و جغرافیہ ہندوستان میں پڑھا ہرات میں جہاد کیا قسطنطنیہ میں شعلہ بار تقریریں کیں مصر میں حیات جدید کا علم بلند کیا۔ پیرس میں داد صحافت دی۔ ایران میں ضوابط ملک مرتب کئے۔ افغانستان کے کابینۂ وزارت میں شامل رہے اور لندن نیویارک اور میونخ روم پیٹرزبرگ اور تہران میں علمی مناظرے کئے اور جہاں گئے اپنے علم و فضل اور خطابت و تقریر سے دھاک بٹھا دی۔

سید جمال الدین افغانی ان مخصوص افراد امت میں سے ہیں۔ جو صدیوں کے بعد دل اور دماغ، علم اور فضل، تحریر و خطابت اور استقلال و استقامت اور جہاد و قربانی کی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شمار ان خوش نصیب فرزندان آدم میں ہے جن کو فطرت کا فیاض ہاتھ پوری فیاضی سے قابلیتیں عطا کرتا ہے۔ سید مجموعہ کمالات

تھے۔ ایک انسان میں بیسیوں باکمال انسان جمع تھے۔ اصلاحِ دین میں سید احمد شہید، حکمت وفقاہت میں سقراط و بوعلی سینا، وسعتِ علم میں ابن خلدون، فصاحت وخطابت میں بے نظیر، بلاغت وشہامت میں سحبان، فلسفہ ودانائی میں ابن رشد، حریتِ فکر میں احمد بن حنبل اور عشق آزادی میں حسینؓ کا سچا فرزند۔

حافظہ اتنا قوی تھا کہ تین ماہ میں بغیر استاد و معلم کے زبان فرنچ سیکھ لی۔ صرف دو روز حروفِ تہجی سمجھنے کے لئے ایک استاد سے امداد لی۔ زبانوں میں سے پشتو، عربی، فارسی، اردو اور فرنچ پر پورا عبور تھا نیز انگریزی اور روسی زبانیں بھی جانتے تھے۔ فلسفہ، تاریخ اسلام، تمدنِ اسلام، علم الالسنہ۔ اور تاریخ انقلاباتِ عالم کی کوئی کتاب ہوگی جو ان کی نظر سے نہ گذری ہوگی۔

ارادہ اتنا مستحکم تھا کہ ۴ برس ایک ہی دمشق میں بسر کر دیئے۔ پابندِ صوم وصلوٰۃ، دین میں نہایت غیور۔ اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرکے یہ دو شعر پڑھا کرتے تھے ؂

دین ترا درپئے آرائش اند | درپئے آرائش و پیرائش اند
بسکہ بستند بر و برگ و ساز | گر تو بہ بینی نشناسیش باز

سید کی دعوت کا خلاصہ

ان کی دعوت تین اجزا پر مشتمل تھی اول اعتصام بحبل اللہ اور تنازع و اختلاف سے مسلمانوں کو دور رکھنا۔ دوم علم وحکمت کو مسلمان کا گم شدہ مال سمجھنا۔ سوم مسلمانوں کی پستی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انہوں نے دین کی پیروی سے منہ موڑ لیا ہے۔ سید مرحوم نہایت شجاع تھے ادبی اعتبار سے بھی اور عسکری لحاظ سے بھی۔ لندن، پیرس، مصر و قسطنطنیہ، نیویارک اور میونچ میں اس مردِ حق گو نے استعمارِ مغرب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی وہ امیر شیر علیخاں کے سامنے حق پیش کرنے سے باز نہ آئے شاہ ایران نے نظر بند کر دیا اور لوگوں سے گفتگو بھی بند کر دی لیکن تبلیغِ حق سے نہ رکے سلطان عبدالحمید کس قدر باجبروت سلطان تھا لیکن سید جمال الدین مرحوم اس سے بھی مرعوب نہ ہوئے قیامِ مصر کے زمانے میں شیخ احمد سوڈانی کا غلغلہ جہاد بلند تھا اور انگریزی حکومت کی نگاہ میں شیخ کے پیرو موجبِ تعزیر لیکن سید مرحوم اس اعلان سے بھی باز نہ رہے کہ شیخ کے اکثر پیرو میرے شاگرد ہیں۔

مصلح امت مجاہد ملت مولانا اسمٰعیل شہید علیہ رحمۃ اللہ

مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ ان جلیل القدر افرادِ امت میں سے ہیں۔ جن کے وجود میں اللہ تعالیٰ نے علم و عمل کی دو گونہ اہلیتیں یکساں طور پر ودیعت کی تھیں۔ اور جنہوں نے امت کی مصیبت کی اندوہناک ظلمتوں میں نمودار ہو کر اپنے علم و فضل، تقویٰ و طہارت، صحت نظر اور کمال بصیرت کے ساتھ ملت کی دینی اور شرعی اصلاح و قیادت بھی کی۔ اور ظلم و فساد کی طاقتیں بدعت و کفر کی ضلالتوں اور جبر و قہر کی قوتوں کو دست و بازو سے مٹانے کی کوشش فرمائی۔ پھر ان کی علمی کاوشوں، ذہنی جودتوں، دماغی صلاحیتوں، دینی بصیرتوں اور شرعی اصلاحوں کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ امت پر اصلاح و تجدید کا ایک نیا دور گزر گیا اور ان کی مجاہدانہ کوششوں کا یہ ثمرہ بھی حاصل ہوا کہ ملت میں ولولہ جہاد، جذبۂ ایثار اور شوق شہادت پیدا ہو گیا۔

جس زمانے میں مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔ اور پھر جس وقت انہوں نے اپنی جان شیریں جان آفریں کو سپرد کی۔ جب ان دونوں زمانوں کا ہم موازنہ کرتے ہیں تو حیرت انگیز انقلاب و تغیر محسوس کرتے ہیں۔ اور جوں جوں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور ان کے عہد پر جتنا عرصہ گزرتا چلا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اصلاح امت اور جہاد و غزا کا جو پودا حضرت شاہ شہید نے اپنے ہاتھوں سے لگایا اور اپنے خون سے سینچا تھا۔ وہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ پھلتا اور پھولتا ہی جاتا ہے۔ تیز و تند آندھیاں آتی ہیں۔ مخالفتوں کے طوفان اٹھتے ہیں، تکفیر و تفسیق کے سیلاب آتے ہیں۔ مگر کلمہ طیبہ کی طرح ان کا لگایا ہوا شجر طیبہ ترقی ہی کرتا جاتا ہے۔ اس کے برگ و بار کی صورتیں بدل جاتی ہیں۔ نواحی میں بھی کچھ تغیر رونما ہو جاتا ہے لیکن اصل درخت جوں کا توں بڑھنے میں مصروف ہے۔

مسلمانانِ ہند کا حال زبوں

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ کہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی ولادت کے وقت

ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت نہ صرف سیاسی اعتبار سے پست و زبوں تھی۔ بلکہ شریعت کے اعتقاد و عمل کے لحاظ سے بھی ناگفتہ بہ تھی۔ اگر سیاسی اعتبار سے مسلمانانِ ہند محکومی و غلامی کی دوہری لعنت میں مبتلا ہو چکے تھے۔ تو دینی گمراہی اعتقادی فسق اور عملی بے راہ روی کی ہزار گونہ مصیبت بھی ان پر نازل ہو چکی تھی۔

ایک طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کا پرچمِ اقبال دہلی کے قلعہ معلّٰی پر لہرا رہا تھا ....
اور دوسری طرف مغلیہ خاندان کا آخری ٹمٹماتا ہوا دیا اپنی نامکمل روشنی اور روز افزوں تاریکی کو زیادہ بھیانک بنا رہا تھا۔ زوال کی تمام ہولناکیاں مسلمانوں پر مسلط ہو چکی تھیں۔ امرا کی عیاشی و آوارگی اور غربا کی بے بسی و ناچاری کا ایک طوفان ہر طرف امڈ رہا تھا۔ علما بزدل تھے اور جرأت حق سے محروم اور عوام اوہام پرست تھے اور دینی علم سے بے خبر۔

ہندوستان کی دینی، اعتقادی، علمی، عملی، اسلامی اور سیاسی حالت کا اندازہ لگانے کے لیے پایۂ تخت دہلی کا حال معلوم کر لینا کافی ہوگا۔ جو صدیوں سے مرکزِ حکومت تھا۔ جس نے علماء و فضلاء، امراء، وزراء اور شہنشاہ اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اور جس کے باشندوں کی معاشرت و تہذیب سارے ملک کی تہذیب و معاشرت تھی سلطانی حرم سرا امراء کے دولتکدے، علماء کی مسندِ علم و افتاء، صوفیوں کی خانقاہیں، مساجد و معابد اور عوام کے کاشانے اوپر سے لے کر نیچے تک فسق و فجور، جہالت و وہم پرستی، کبر و غرور بے غیرتی اور بے حیائی کے گھروندے تھے۔ ہندوانہ رسمیں عام طور پر رائج تھیں۔ اور اسلامی رسوم کی جگہ لے چکی تھیں۔ سرِ بازار شرابیں پی جاتی تھیں۔ امرا گھنگھرو باندھ کر ناچتے تھے۔ ڈوموں اور میراثیوں کی بن آئی تھی۔ رقص کرنے والے صوفی اور بھنگ گھوٹنے والے اوباش وقت کے قطب اور ابدال تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جوا کھیلا جاتا تھا۔ علمائے حق بے وقار تھے اور علمائے سوء صاحبِ اقتدار۔ دینی جہالت کا یہ عالم تھا کہ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا حرام تھا اور حدیث و سنت کا نام لینا گناہ۔ فقہ کو دین کی بنیاد سمجھتے تھے لیکن فقہ ائمہ مجتہدین کی فقہ نہ تھی بلکہ کٹ ملاؤں کی خواہشوں کی تفسیر لچے اور شہدے حامیانِ دین تھے۔ اور اوباش اور بدمعاش محافظانِ شرعِ متین

اس بدینی اور اوہام پرستی کے ساتھ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ پیروانِ حق میں بھی اعلانِ حق کی جرأت نہ تھی۔ امراء و ملوک میں جہاد و شہادت کا جذبہ مفقود تھا۔ دینی غیرت کیساتھ سیاسی حمیت بھی جا چکی تھی۔ دربارِ دہلی کی عین آنکھوں کے سامنے پنجاب میں مسلمانوں پر قیامت خیز مظالم ٹوٹ رہے تھے لیکن نہ شاہ دہلی کو توجہ ہوتی تھی اور نہ امراء و وزراء کو پروا۔

شاہ اسمٰعیل کے ابتدائی حالات

ہندوستان میں اسلام اور ملت پر یہ حالات گذر رہے تھے کہ حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان میں ۱۲ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ کو شاہ عبدالغنی رح کے گھر میں وہ آفتابِ حق طلوع ہوا جس نے جوان ہوتے ہوتے ہر طرف علم و عمل کی روشنی سے چکا چوند کا عالم پیدا کر دیا۔ شاہ شہید کا خاندان دہلی میں علم و فضل کا سرتاج تسلیم کیا جاتا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شاہ رفیع الدین جیسے بزرگانِ اسلام تھے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ کل عالمِ اسلام ان کی بارگاہِ عظمت کے سامنے سرِ عقیدت خم کرتا تھا۔ اس خاندان کے وجود سے دہلی اور دہلی کے باہر ہندوستان کے گوشے گوشے میں علومِ شریعت کی شمع روشن تھی۔ ترکستان، افغانستان اور عرب تک سے طالبانِ علم آتے تھے۔ اور برسوں اسی خاندان کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے علم حاصل کرتے تھے۔ جب حضرت شاہ اسمٰعیل پیدا ہوئے تو ہر طرف اس خانوادۂ فضیلت کا چرچا تھا۔ اور اسی خانوادۂ فضیلت کی آغوش میں انہوں نے تربیت حاصل کی۔ انہیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کا ذہن بلا کا رسا، طبیعت غضب کی جید اور حافظہ نہایت قوی تھا۔ چنانچہ گیارہ بارہ برس کی عمر میں صرف و نحو کی کتابیں پاس کر لیں۔ اور ریاضی، منطق، فلسفہ، ہیئت اور جغرافیے کی کتابیں پڑھنے لگے اور جب ۱۶ سال کے ہوئے تو علمِ دین کا مروجہ نصاب بھی حاصل کر چکے تھے اور فارغ التحصیل ہو کر اپنے خاندان کے مدرسے میں تعلیم دینے لگے تھے۔

فنونِ جنگ کی تعلیم

علم کا خاصہ ہے کہ وہ صاحبِ علم کو بیکار نہیں بیٹھنے دیتا۔ شاہ اسمٰعیل کی طبیعت پہلے ہی بے چین تھی علم نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور شاہ صاحب فراغتِ تحصیل کے بعد

تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے۔ فطرت نے جو دولت فیض کے ساتھ حسن خطابت اور جوش تقریر بھی عطا فرمایا تھا۔ شاہ صاحب نے خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو اصلاح خلق میں استعمال کرنا شروع کیا۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ شاہ صاحب محض عالم دین تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جن مقاصد عالیہ اور مہمات امور کے لیئے پیدا کیا تھا۔ ان کی تکمیل کے لیئے علم کے ساتھ عمل اور جوش خطابت کے ساتھ ولولہ جہاد بھی ارزانی تھا۔ اور شاہ صاحب نے جہاں علم دین کی تکمیل کی تھی وہاں فنون جنگ کی بھی پوری طرح مشق بہم پہنچائی تھی کشتی کے فن میں اتنے ماہر تھے کہ بڑے بڑے پہلوان خم کھاتے تھے۔ گھوڑے کی سواری میاں رحیم بخش چابک سوار سے سیکھی۔ جو اپنے وقت کا بہترین زین سوار تھا۔ شاہ صاحب چھریرے بدن کے تھے۔ اور قد متوسط تھا تاہم بلند سے بلند گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہی بغیر رکاب کے سوار ہو جاتے تھے۔ چالیس میل کا چکر گھوڑے پر مار لینا ان کے لیئے کھیل تھا۔ پٹہ بازی مرزا رحمت اللہ بیگ سے حاصل کی۔ یہ شخص کل شہزادوں کا استاد تھا۔ اسی طرح بنوٹ میں بھی کمال حاصل کیا۔ بندوق کا نشانہ لگانے میں بے خطا تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ ناممکن ہے کہ جانور میرے سامنے آئے اور زندہ نکل جائے۔ سپاہیانہ فنون کی تکمیل کے بعد تیراکی کی طرف توجہ کی۔ اور اس میں اتنی مشق بہم پہنچائی کہ تین تین دن جمنا کی موجوں سے کھیلتے رہتے۔ اور اسی حالت میں طلبہ کو سبق بھی دیا کرتے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ شاہ صاحب چار برس پانی میں رہے کئی مرتبہ دہلی سے آگرہ اور آگرہ سے دہلی جمنا کی راہ سے آئے گئے۔ اس زمانے میں لوگ شاہ صاحب کو جل مانس کہا کرتے تھے۔ یہ تمام مرحلے ۱۲ برس کی عمر تک طے ہوئے۔ اب شاہ صاحب نے اپنے جسم کی قوتوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پا پیادہ دوڑنا ایک سانس میں آٹھ آٹھ دس دس میل چلے جانا۔ جھلستی ہوئی دھوپ میں جلتی ہوئی سڑک پر آہستہ آہستہ ننگے پا چلنا مسجد فتحپوری کے سرخ پتھر کے فرش پر گرمیوں میں عین دوپہر کے وقت گھنٹوں آہستہ آہستہ ننگے پاؤں ٹہلنا تین تین چار چار دن بھوکا پیاسا رہنا کڑکتے ہوئے جاڑوں میں ننگے بدن رہنا۔ کم سونا بلکہ کئی کئی دن تک بالکل نہ سونا۔ الغرض جسمانی اعتبار سے جو مشقتیں اٹھائی جا سکتی ہیں۔ ان سب کی مشق شاہ صاحب نے بہم پہنچالی۔ اور ایک ایسے جفاکش

سپاہی اور مرد مجاہد بن گئے۔ کہ عرصۂ جہاد میں جو مرحلہ درپیش ہو۔ اس میں کامیاب نکلیں۔

دعوت و اصلاح کا آغاز

جب جسم و جان اور ذہن و دماغ کی تمام طاقتیں عروج کمال کو پہنچ گئیں۔ تو شاہ صاحب نے اصلاح خلق کے لئے ان کو استعمال کرنا شروع کیا۔ علم کی تحصیل پہلے ہوئی تھی۔ لہٰذا اس کا استعمال بھی سب سے پہلے ہوا۔ دہلی شرک و بدعت کا مرکز تھا۔ دین کی محبت غائب ہو چکی تھی۔ کتاب و سنت کی طرف سے توجہ بالکل ہٹ گئی تھی۔ خانہ ساز اوہام نے دین کی جگہ لے لی تھی۔ خدا کی پرستش کی بجائے ولیوں، پیروں، شہیدوں اور صوفیوں کی پوجا ہوتی تھی۔ نذر نیاز چڑھاوے میلوں اور تماشوں کی گرم بازاری تھی۔ نکاح بیوگان متروک تھا اور شراب خوری و زنا عام تھے ہندوانہ رسوم اور مشرکانہ عادات اسلامی تہذیب کا جزو اعظم تھے۔ مذہب کے نام سے ہر قسم کی خرافات کا رواج تھا۔ شاہ صاحب نے جس وقت میدان اصلاح میں قدم رکھا تو مشکلات و موانع کا ایک کوہستانی سلسلہ راہ میں حائل تھا۔ علماء خود غرض تھے اور عوام جاہل۔ لہٰذا جس وقت جامع مسجد کے منبر پر سے کتاب و سنت اور توحید و رسالت کا نعرۂ حق بلند ہوا۔ تو ہر طرف ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ سعید روحوں نے خوش آمدید کہا اور خود غرضوں اور نفس پرستوں نے الاماں پکارا۔ دہلی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مخالفت و عناد کا طوفان برپا ہو گیا۔ عیاش علمائے نے مساوات اسلامی کا نام سن کر اپنے تخت استکبار کے تختوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا خود پرست علماء نے کتاب و سنت کی دعوت میں اپنی اجارہ داری کی تباہی محسوس کی۔ عوام نے توحید کی پکار میں اپنے خود ساختہ عقاید اور خانہ ساز خداؤں کی توقیر کے لئے خطرہ محسوس کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وابستگان دامن نے اپنے اقتدار اور اپنے خداوندان نعمت کے رعب و وقار کو زایل ہوتے ہوئے پایا۔ عوام کی بیداری۔ خواص کا احساس فرض اور شریعت کی بحالی ایسی چیزیں نہ تھیں۔ کہ نفسانیت اور خود غرضی گھبرا نہ جاتیں۔ شاہ صاحب کو قتل کرنے کے منصوبے ہونے لگے۔ ان کو اسلام کا دشمن۔ رسول کا معاند بزرگان دین کا مخالف اور امن کے لئے خطرہ بنایا گیا۔ ان کے وعظوں پر پابندیاں عاید کرائی گئیں۔ ان کو وہابی کہہ کر گردن زدنی قرار دیا گیا۔ اور فضا ایسی زہر آلود کر دی گئی۔ کہ بظاہر حق مغلوب اور باطل قہرمان نظر آنے لگا۔ پنجاب کے

مرکز لاہور سے قاتل بلوائے گئے۔ دہلی کے بھکیت اور پٹہ باز خون کے پیاسے ہو کر پھرنے لگے۔ رزیڈنٹ سے رپوٹیں کی گئیں۔ اکبر شاہ ثانی سے چغلیاں کھائی گئیں۔ اور یہ سب کس لئے کہ شاہ اسمٰعیل اپنے وعظوں کے ذریعے اسلام کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی پکار ایک ہی پکار تھی۔ مسلمانو! صرف خدا کو پوجو وہی تمہارا کارساز، حاجت روا اور دستگیر ہے۔ رسولؐ کی پیروی کرو اسی کی پیروی میں نجات ہے۔ قرآن کے احکام پر عمل کرو اور رسولؐ کے ارشادات کے مطابق زندگی بسر کرو۔ مشرکانہ رسموں سے توبہ کرو۔ غیر اسلامی عادات و اطوار سے الگ ہو جاؤ۔ وہ رنڈیوں کے مکانوں تک پہنچے اور ان کو نکاح کرنے پر مائل کیا۔ وہ صوفیوں کی خانقاہوں میں گئے اور ان کو راہ راست پر لائے۔ وہ بادشاہ کے دربار میں پہنچے۔ اور پیروئ حق کا پیغام پہنچایا۔ یہاں تک کہ حق و باطل کی معرکہ آرائی کے نتائج نکلنے لگے۔ کتاب و سنت کا چرچا عام ہوگیا۔ پیروی شریعت کا غلغلہ بلند ہوگیا۔ اور جو باتیں علمائے حق چھپ چھپ کر کہتے تھے برملا کہی جانے لگیں اور پیروان حق فاتح و منصور ہو گئے۔

حضرت سید احمدؒ کا ظہور

ایک طرف فیضان قدرت کی کارفرمائی شاہ اسمٰعیل شہید کو جہاد اسلامی اور تبلیغ ہدایت کے لئے تیار کر رہی تھی۔ اور دوسری طرف خانوادۂ رسالت کا ایک اور چشم و چراغ خاص نگرانی الٰہی میں پروان چڑھ رہا تھا۔ اور رائے بریلی یو۔ پی کے ایک سید خاندان میں ایک نوجوان حضرت سید احمد کے نام سے بالکل اسی قسم کی تربیت سے بہرہ مند ہو رہا تھا حضرت سید احمد کو علم ظاہری سے کوئی وافر حصہ نہ ملا تھا۔ لیکن علم لدنی کے وہ پردہ ہائے اسرار ان کی نظروں سے اٹھ رہے تھے۔ جو خاص خاص افراد امت کی نظروں سے اٹھا کرتے ہیں۔ حضرت سید احمد کا عنفوان شباب بھی سپاہیانہ مجاہدے میں گذرا تھا۔ جفاکش، محنتی، خادم خلق اور ساتھ ہی انتہا درجے کے متقی پرہیزگار اور صحیح العقیدہ۔ مورخ جب ان کی دینی بصیرت کے حالات قلمبند کرتا ہے تو اس کا قلم انگشت حیرت منہ میں داب کر رہ جاتا ہے۔ علم دین سے ناواقف ہونے کے باوجود ان کی قرآنی صحیح فہم ... بڑے بڑے علمائے دین دنگ ہو کر رہ گئے۔ جب رائے بریلی سے سید صاحب علم دین کی تحصیل کے لئے دہلی آئے اور علم و فضل کے

دینی مرکز خاندان ولی اللّٰہی کے سامنے زانوئے تلمذ و ادب طے کرنے لگے۔ تو شاہ عبد العزیز صاحب نے کہ وقت کے شیخ بھی تھے بیعت کرتے ہوئے تصور شیخ کی ہدایت کی لیکن اس بادۂ توحید کے سرمست ازلی نے صاف انکار کر دیا۔ شیخ نے کہا کہ حافظ شیراز کے قول کے مطابق اگر پیر مغاں "سجادۂ تقویٰ کو مئے رندی سے بھی آلودہ کرنے کا حکم دے تو اسے بلا تکلف آلودہ کر دینا چاہیئے لیکن ان پڑھ سید نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت اگر شراب پینے کا حکم دیجئے تو تعمیل سے انکار نہیں کہ بہرحال وہ ایک معصیت ہے اور توبہ سے دور ہو سکتی ہے لیکن شرک کے لوازم کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ خواہ اس کا حکم شیخ ہی دے۔ شاہ عبد العزیز صاحب اس لدنی منطق کے سامنے لاجواب ہو گئے۔ اس ایک واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ فیضان قدرت نے حضرت سید احمد کی فطرت میں دینی بصیرت اور شرعی نظر کے کیسے کیسے خزانے ودیعت کر دیئے تھے کہ جن اسرار و نکات کی اطلاع اہل علم کو بھی نہ تھی ان سے یہ کم پڑھا لکھا سید آگاہ و واقف تھا۔

شاہ صاحب کی بیعت

جب دینی بصیرت کا یہ عالم ہو۔ تو ممکن نہ تھا کہ سیاسی نبض شناسی سے حضرت سید احمد بے خبر ہوتے۔ چنانچہ وہ ابتدا ہی سے مجاہدانہ مشاغل کے عادی تھے۔ اتفاق سے جس وقت سید صاحب دہلی میں مقیم تھے۔ تو مولانا سید عبد الحی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ سید صاحب علم و فضل کے بحر بے کنار تھے لیکن سید صاحب کی ایک ہی نگاہ نے ان کو موہ لیا۔ اور وہ ان سے بیعت ہو گئے۔ یہ بیعت سید صاحب کے ساتھ شاہ اسمٰعیل کے تعارف کا باعث ہو گئی۔ جنہوں نے پہلی ہی ملاقات میں معلوم کر لیا کہ ان کی بے چین اور مضطرب روح جس ہادی و امام کی طلب گار تھی وہ یہی مرد حق ہے۔ جو اپنے عہد کا امام برحق اور اپنے وطن کا ہادی صادق ہے۔ چنانچہ اس روز سے آخر روز تک جب شاہ صاحب تیغ جہاد علم کئے ہوئے جام شہادت کو لبیک کہتے ہوئے بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ وہ حضرت سید احمد کے ساتھ ایک مرید مخلص اور پیر و صادق کے طور پر رہے اور اپنی روح کی تسکین کا پورا سامان پایا۔

سکھوں سے جہاد کا عزم

شاہ اسمٰعیل صاحب کی زندگی کا اب دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اب تک

ان کی تمام کوششیں انفرادی جدوجہد کی حیثیت رکھتی تھیں۔ آپ ؒ سے ان کی ہر کوشش ایک امام کی قیادت میں منظم طور پر ہونے لگیں۔ حضرت سید احمد صاحب کو جب پنجاب کے مسلمانوں کی مصیبتوں کا علم ہوا اور شاہ اسمٰعیل شہید نے اپنے چشم دید حالات سنائے۔ تو فوراً جہاد و تبلیغ کا ایک مستقل عزم کر لیا گیا جس کی ترتیب اس طرح تھی کہ ہندوستان کے اس حصے سے مجاہدین کی صفیں تیار کی جائیں جو انگریزی کمپنی کے ماتحت اور مغل بادشاہوں کی سرپرستی میں زندگی بسر کر رہا ہے اور ابھی پوری طرح جہاد و شہادت کے ولولوں سے محروم نہیں ہوا۔ مجاہدین کی اس فوج کو ساتھ لے کر ملک سے ہجرت کی جائے کہ ایک محکوم ملک میں رہ کر جہاد ناممکن ہے ہجرت اس علاقے میں کی جائے جو پنجاب کی سرحد پر آزاد قبائل سے بھرا ہوا ہے۔ ساتھ ہی افغانستان کے ارباب حکومت سے امداد لی جائے۔ اس کے بعد پنجاب پر مغربی سمت سے حملہ کر کے پنجاب کے مسلمانوں کو غیر مسلم غلبہ و تسلط سے نجات دلائی جائے۔ جب پنجاب میں صحیح شرعی حکومت قائم ہو جائے۔ تو دوسرا قدم ہندوستان کے بقیہ حصے کو اغیار کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے اٹھایا جائے۔ حضرت سید احمدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیلؒ کے سیاسی اور مجاہدانہ پروگرام کا یہ ایک حصہ تھا لیکن اس کی بنیاد دین و شریعت کی سچی پیروی اور عقائد و اعمال کی مستقل اصلاح پر تھی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق حضرت سید احمد نے بھی مجاہدین کے لشکر کی تیاری کے لئے اس امر کو ضروری جانا کہ پہلے مجاہدین کو سچا مسلمان بنایا جائے کہ ایک سچا مسلمان ہی جہاد و شہادت کے ولولے سے سرشار ہو سکتا ہے اور بے دین مشرکانہ رسوم و عادات کا پابند اور جاہلانہ اوہام کا پیرو اسلام کے لئے کبھی دلی آمادگی کے ساتھ جان نہیں دے سکتا۔

جہاد و ہجرت کی تیاری

اس غرض کے لئے حضرت سید احمد صاحب نے شاہ اسمٰعیل اور مولانا سید عبدالحی کو ساتھ لے کر شمالی ہند کا دورہ شروع کیا۔ یہ قافلۂ ہدایت جس طرف گیا اسلام کی روشنی سے در و دیوار منور ہو گئے سالہا برس کی گمراہی اور بدعات کی تاریکی دُم دبا کر بھاگنے لگی اور نہ صرف مسلمان سچے مسلمان بننے لگے۔ بلکہ غیر مسلم بھی حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سید صاحب

کی دعوت اصلاح سے چالیس لاکھ مسلمان ہوئے۔ اور اس دعوت میں جہاں تک ظاہری جدو
جہد وعظ و تبلیغ اور افہام و تفہیم کا تعلق ہے۔ شاہ اسمٰعیل صاحب کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔
حضرت سید احمد کا روحانی فیضان اور شاہ صاحب کا جہاد لسان دونوں مل کر اعجاز رونما
کر رہے تھے جس طرف نکل جاتے تھے۔ اسلام کی لگن دلوں میں لگتی چلی جاتی تھی قال اللہ و
قال الرسول اللہ کی صدائیں بلند سے گساری سے توبہ فسق و فجور سے دست کشی اور اعمال
صالحہ کا چرچا ہوتا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صحابہ کرام کا عہد مبارک پھر عود کر آیا ہے۔
اللہ اکبر! یہ لوگ آدمی نہ تھے فرشتے تھے۔ جو دن کو محنت مزدوری کرتے اور راتوں کو یاد الٰہی
میں مصروف رہتے بڑے بڑے ناز پروردہ امراء آئے اور درویش بن کر رہ گئے لیکن کیسے
درویش۔ بھیک منگے فقیر نہیں بلکہ ولولۂ جہاد کے سرفروش پیکر۔

یہ قافلہ حق و ہدایت دہلی سے ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا اور وہاں سے مشرق کی طرف
کوچ کرتا ہوا کلکتہ میں قیام پذیر ہوا۔ جہاں سے جہازوں میں سوار ہو کر جدہ میں لنگر انداز ہوا
اس کے بعد حج و زیارت کی سعادت حاصل کی اور واپس ہندوستان لوٹا۔ اس طریق سے
حضرت سید احمدؒ نے ایک ایسی جماعت صالح تیار کر لی جس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا اسلام
تھا اور یہی قسم کی جماعت جہاد اسلامی کے لئے سازگار ہو سکتی ہے بے دینوں اور فاسقوں
سے اسلام کی خدمت کی توقع رکھنا احمقوں کا کام ہے۔

افغانستان کا سفر

جب یہ جماعت اس طرح تیار ہو گئی تو مولانا اسمٰعیل شہید نے اپنے امام و پیشوا کی قیادت میں ہجرت کی منزل
دشوار گذار میں قدم رکھا اور مجاہدین صالحین کا مختصر سا لشکر سندھ اور بلوچستان سے ہوتا ہوا
افغانستان کی سرزمین میں پہنچا پہلے قندھار۔ قندھار سے غزنی اور غزنی سے کابل اور کابل
سے پشاور۔ اس تمام اثنا میں ہر مقام کے مسلمان جوق در جوق حاضر ہو کر حضرت سید احمد
صاحب سے بیعت اصلاح و تقویٰ سے مشرف ہوئے اور حضرت اسمٰعیل کے مواعظ سے مستفید۔

اب قافلہ جہاد کی آخری منزل آگئی تھی۔ پشاور سے لشکر مجاہدین نوشہرہ میں آیا۔ اور
یہاں سے حکومت لاہور کے نام ایک اعلام نامہ روانہ کیا گیا۔ جس میں اسلام قبول کرنے کی دعوت

اور انکار پر اطاعت اختیار کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ اور اس سے بھی انکار کرنے کی صورت میں جنگ کے لئے تیار ہو جانے کی اطلاع دی گئی تھی۔ حکومت لاہور نے سردار بدھ سنگھ کو دس ہزار لشکر دے کر مقابلہ کرنے کے لئے بھیجا جس نے اکوڑہ میں آکر پڑاؤ کیا۔

اس لشکر کفار کی سرکوبی کے لئے ہو لشکر ترتیب دیا گیا تھا۔ اس کا مقدمۃ الجیش شاہ اسمٰعیل صاحب کی ماتحتی میں تھا۔ اس لشکر نے سکھوں پر شبخون مارا اور گوادل الذکر کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ تاہم اس نے اس تہور کے ساتھ حملہ کیا۔ کہ سکھ بدحواس ہو کر بھاگ نکلے اور ان کا توپخانہ مجاہدین کے قبضے میں آگیا لیکن ملکی لوگ مال غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو گئے اور آئی ہوئی فتح واپس ہو گئی۔ بہرحال اس میں دشمن کا سخت نقصان ہوا! اور مجاہدین کے حوصلے بڑھ گئے۔

امام کا تقرر

اب معرکہ جہاد باقاعدگی اختیار کر گیا تھا اور ضرورت پیش آگئی تھی کہ باقاعدہ طور پر ایک امام کا انتخاب عمل میں آجائے۔ چنانچہ حضرت سید احمد صاحب کو امام مطاع تسلیم کیا گیا۔ پہلے جو بیعت جہاد اور تقویٰ کے لئے ہوتی تھی۔ اب خلافت و امارت کے لئے ہونے لگی اور مجاہدین کا نظام صحیح معنی میں اسلامی خلافت کے اصولوں پر قائم ہو گیا۔ حضرت اسمٰعیل نے امامت کے مسئلے پر زبردست تقریریں کیں۔ اور اس کی ضرورت و اہمیت کے ایسے محکم دلائل دیئے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسئلہ واضح ہو گیا۔ ایک طرف مجاہدین میں نظام شرعی رائج کر دیا گیا جس سے تمام علاقے کی زندگی اسلامی زندگی ہو گئی۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ قرن اول کا دور شرعی عرب سے اٹھ کر سرحد ہند میں چلا آیا ہے اور دوسری طرف جہاد و غزا کی طرح ڈال دی گئی مجاہدین نے سکھ فوجوں کو کئی مقامات پر شکستیں دیں اور حضرو تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ مجاہدین کا لشکر ایک لاکھ تک پہنچ گیا لیکن لشکر اسلام کی فتوحات سے اول مقامی امراء و روسا کے دل میں حسد کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ دوسرے ان پر شرعی نظام کے دستور حکومت اور اصلاح و تقویٰ کے ماحول کی پابندیاں شاق گذرنے لگیں اور تیسرے دربار لاہور کی ریشہ دوانیاں اثر انداز ہونے لگیں اور پنجاب کی حکومت کا روپیہ ملکی سرداروں کو بے ایمان و منافق بنانے لگا یہاں تک

کہ ایک مرتبہ سیدو کے میدان جنگ کی تیاریاں تھیں سرداران پشاور نے عین معرکہ جہاد کے اندر سید احمد صاحب کو زہر دیدیا۔ مولانا اسمٰعیل اس جنگ میں سید صاحب کی علالت کے باعث تن تنہا سپہ سالاری کر رہے تھے۔ اور انہوں نے اس حسن تدبیر کے ساتھ جنگ کی کہ دشمن کے چھکے چھڑا دیئے لیکن عین میدان جنگ میں پشاوری سرداروں کی غداری اور سکھوں سے سازباز نے میدان کا پانسہ پلٹ دیا اور شاہ صاحب اپنے امام حضرت سید احمد کو جو علالت کی حالت میں ہاتھی پر بیٹھے ہوئے کمان کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ ہاتھی توپوں کا نشانہ ہے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر میدان جنگ سے باہر لے گئے۔

حیرت انگیز بہادری

اس کے بعد کئی اور معرکے ہوئے جن میں شاہ صاحب نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرح حیرت انگیز جرأت و شجاعت سے کام لیا۔ ایک مرتبہ صرف ۱۱ آدمیوں کے ساتھ ہزار دل سکھوں کو روکا۔ اس موقعہ پر ایک سکھ تلوار کھینچ کر آپ پر بڑھا شاہ صاحب نے اسے فی الفور گولی سے اڑا دیا۔ اس پر دوسرا سکھ نمودار ہوا اور تلوار کا وار کرنا چاہتا تھا کہ آپ نے دوسری گولی اس پر داغ دی تیسری مرتبہ بندوق بھر رہے تھے۔ کہ ایک سکھ کی گولی انگلی پر لگی۔ اور ہاتھ بندوق سے الگ ہو گیا عین اس وقت ایک نہنگ سکھ کرپان لیئے ہوتے حملہ آور ہوا۔ شاہ صاحب نے خالی بندوق ہی اس کی طرف پھینک دی۔ اور وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اتنے میں کفار کے پاؤں اکھڑ گئے مولانا اسمٰعیل اس انگشت شہادت کی طرف اشارہ کر کے کہا کرتے تھے۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ قبول کرے تو یہ انگشت شہادت بھی بہت ہے۔ ورنہ بہت سے زخم لگتے ہیں۔ اور ان میں کوئی ثواب نہیں ملتا۔

پٹھانوں کی غداری

لشکر مجاہدین کو سیدو کے معرکے کے بعد دو دشمنوں سے پالا پڑ گیا تھا۔ اول سکھ حکومت دوسرے سرداران پشاور جب سکھوں کی فوج مجاہدین اسلام کا مقابلہ کرتی تو سرداران پشاور سکھوں کی امداد کرتے۔ بلکہ خود میدان میں اتر کر طرح جنگ ڈالتے تھے۔ ایک معرکے میں ۴ ہزار درانی مجاہدین کے مقابلے کے لئے زمان زئی میں جمع ہوئے لیکن شاہ اسمٰعیل صاحب کے حسن تدبیر

سے ان کی توپوں پر قبضہ ہوگیا اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ بالآخر رنجیت سنگھ نے اپنے فرانسیسی جرنیل ونٹورا کو سردار خادیخاں کی دعوت پر بیس ہزار فوج اور بے شمار توپوں کے ساتھ حملہ کرنے کا حکم دیا۔ مجاہدین کی تعداد اس وقت ... تھی۔ اس موقعہ پر مولانا اسمٰعیل نے آیت بیعت الرضوان پڑھ کر اس جوش و خروش کے ساتھ تقریر کی کہ تمام مجاہدین نے حضرت سید احمد صاحب کے ہاتھ پر شہادت کی بیعت کی۔ اس کے بعد دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا لیکن جرنیل ونٹورا پر لشکرِ اسلام کی کچھ ایسی ہیبت بیٹھی کہ اس کو تمام میدان سوار و پیادہ سے بھرا ہوا نظر آیا اور معمولی سے معرکے کے بعد وہ دریائے سندھ کو عبور کر کے واپس چلا گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا پیغام

اس کے بعد کچھ اور معرکے ہوئے جن میں بعض اوقات دُرّانی ایک طرف ہوتے تھے اور مجاہدین دوسری طرف اور بعض اوقات سکھ اور دُرّانی مل کر لڑتے تھے اور مجاہدین ان کا مقابلہ کرتے تھے۔ ان تمام معرکوں میں شاہ اسمٰعیل صاحب شامل رہے اور جہاد کے ارمان دل کھول کر نکالے یہاں تک کہ دریائے اٹک کا پورا علاقہ مجاہدین کے تصرف میں آگیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ آمادہ ہوگیا کہ اٹک پار کا علاقہ مجاہدین کو دے دے جس میں وہ شرعی حکومت قائم کرلیں لیکن حضرت سید احمد اس کے لئے تیار نہ ہوئے۔ سارا پنجاب کفار کے ظلم و ستم سے نجات کا طلبگار تھا۔ اس اثنا میں پشاور کے سرداروں کی غداریوں کے باعث مجاہدین کو نادر ہی اندر بہت نقصان پہنچا اور ہر طرف افغانی غداروں نے فتنہ برپا کردیا۔ یہاں تک کہ حضرت سید احمد صاحب نے اپنے ہمراہیوں کو ساتھ لے کر سندھ تشریف لے جانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ اس علاقے کو اپنا مرکزِ جہاد قرار دے کر از سرِ نو جد و جہد کی تیاری شروع کریں۔ چنانچہ اپنے مخلص ساتھیوں کو لے کر سید صاحب واپس روانہ ہوگئے۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد سکھوں نے غدار پٹھانوں پر اس سختی سے حملہ کیا کہ سب کو کاٹ کر رکھ دیا اور غداران ملت کو اسی دنیا میں ان کے نفاق کی سزا مل گئی۔

بالاکوٹ کا معرکہ اور شہادت

واپسی پر سید صاحب اور ان کے مجاہد ہمراہی بالاکوٹ پہنچے جو ضلع ہزارہ میں

(... پریس ... میں باہتمام ملک دل محمد پرنٹر حمید اکرم ایس۔ اے نسیم پبلشر نے شائع کیا)

واقع ہے اور ایک محفوظ درے میں قیام فرمایا۔ راجہ شیر سنگھ بھی تعاقب میں تھا۔ اس نے
اپنی فوجیں اور توپیں سب طرف سے ہٹا کر بالاکوٹ میں جمع کر دیں۔ سید صاحب نے
بالاکوٹ جانے کے دونوں راستوں پر محافظ متعین کر دیئے۔ شیر سنگھ کئی روز تک موقعہ کی
تلاش میں رہا لیکن اسے بالاکوٹ کی تسخیر کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس نے دیکھا کہ پہاڑوں
کے درمیان سے جو راستہ لاہور سے آتا ہوا بالاکوٹ گیا ہے ایک درے کی طرح واقع ہے
جس کے چند محافظ بڑی سے بڑی فوج کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور دوسرے رستے کا اس کو علم
نہیں تھا جو پہاڑوں سے ہو کر جاتا تھا اور اس کو صرف مقامی لوگ ہی جانتے تھے۔ یہ دیکھ کر
وہ تسخیر بالاکوٹ کو ناممکن سمجھ کر جانے والا تھا کہ اسلام کی قسمت کا ایک بدنصیب ستارہ نمودار
ہوا اور محافظین ہی میں سے ایک شخص نے شیر سنگھ کو کوہستانی رستے کا حال بتا دیا۔ اور
اس کے آدمی کو ساتھ لا کر اچھی طرح سمجھا دیا۔ چنانچہ ایک رات کو اس نے اپنا لشکر مور و ملخ
کی طرح پہاڑ پر پھیلا دیا۔ جب مجاہدین نے یہ حال دیکھا تو ان کے جوش و خروش کا عالم ہی
دوسرا تھا۔ شہادت کا شوق دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ اور وہ اپنے اللہ کے سامنے سرخرو ہو کر
جانے کے لئے بے تاب ہو گئے۔ اس جنگ میں جو سلسلۂ جہاد کی آخری جنگ تھی شاہ اسمٰعیل شہید
نے خدا کے دیئے ہوئے تمام جوہروں کو بے دریغ اسلام کی خدمت میں نچھاور کر دیا۔ ان کی
جرأت و مردانگی ان کا جوش جہاد۔ ان کا توکل علی اللہ۔ ان کی بے پناہ قادر اندازی۔ ان کی
حرارت ایمانی پورے زوروں پر تھی۔ وہ جس طرف جاتے تھے کفار بکریوں کی طرح بھاگ
کھڑے ہوتے تھے۔ حضرت سید احمد صاحب نے شاہ صاحب سے بہت کہا کہ اس میدان میں
ہماری فتح نہیں ہے۔ آپ اس میں نہ جایئے۔ آپ کے جہاد لسان سے اسلام کو بہت فائدہ
پہنچیگا۔ مگر وہاں تو شہادت کی تمنا بے تاب تھی۔ چنانچہ شاہ صاحب جی کھول کر لڑے۔ اور
بالآخر پیشانی میں زخم کاری کھا کر شہید ہونے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن ۔۔۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضرت سید احمد بھی اس معرکے میں شہید ہوئے یہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ کا واقعہ ہے سکھوں نے سید صاحب اور شاہ صاحب کے
جسد مبارک کو شناخت کر کے اسلامی طریق پر پورے احترام کے ساتھ دفن کر دیا مجاہدین کی صفیں منتشر ہو گئیں اور جو بچے
وہ پہاڑیوں اور وادیوں میں گم ہو گئے کچھ نواب وزیر الدولہ مرحوم کی درخواست پر ٹونک چلے گئے اور کچھ تھانہ چلے گئے